سرسیّد، اقبالؔ اور علی گڑھ

اصغر عبّاس

ایجوکیشنل بُک ہاؤس ○ علی گڑھ

اشاعت : ـــــــ ۱۹۸۷ء

طباعت : ـــــــ نازیہ آفسٹ پریس دہلی

کتابت : ـــــــ عتیق احمد

تعداد : ـــــــ ۱۰۰۰

قیمت : ـــــــ دس روپیہ

ایجوکیشنل بُک ہاؤس

یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

شروع کی بات

اقبال کی شعری بصیرت اور ان کے ذہنی سفر پر قابلِ قدر کتابیں اور مضامین شائع ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں لیکن علی گڑھ سے اقبال کے کیا روابط تھے اور انھوں نے علی گڑھ کی کیا خدمات انجام دیں اور علی گڑھ نے انھیں کیا دیا اس کی طرف قابلِ لحاظ توجہ نہیں ہو سکی ہے۔ صرف اشاروں سے کام لیا گیا ہے۔

اقبال علی گڑھ کے فارغ التحصیل نہیں تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے زادِ راہ میں علی گڑھ کے گہرے آثار و نقوش ملتے ہیں وہ علی گڑھ سے متاثر بھی تھے اور اس پر اثر انداز بھی، لیکن یہاں ان اثرات کا جائزہ مقصود نہیں بلکہ اس رسالے میں صرف اقبال اور علی گڑھ کے ربط و تعلق کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اقبالیات کے مطالعے میں یہ پہلو بھی نظر انداز نہ ہو۔ اس سلسلے میں ہمیں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے اس کا فیصلہ ناظرین فرمائیں گے۔

اس رسالے کے کچھ حصے اقبال انٹرنیشنل سمینار میں پڑھے گئے جس کا اہتمام اسی سال وسط فروری میں شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی نے کیا تھا۔

اصغر عباس

شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۲ ربیع الاول ۱۴۰۳ھ مطابق ۵ نومبر ۱۹۸۲ء

یہاں ملتا رہے گا سوز و سازِ آرزو برسوں
کیا ہے خونِ دل سے اِک قلندر نے وضو برسوں

(سرور)

سرسیدؔ اقبالؔ اور علی گڑھ

افکارِ نو کے فروغ کے لئے سرسید نے چار مرتبہ پنجاب کا سفر کیا۔ پہلی بار ۱۸۷۳ء میں سرزمینِ پنجاب سرسید کے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز ہوئی اور اسی زمانے میں سارا پنجاب سرسید کی آواز پر اس طرح دوڑا جیسے پیاسا پانی کے لیے دوڑتا ہے ان میں اقبال کے اُستاد سید میر حسن بھی تھے۔ وہ سرسید کے افکار سے اتنے سیراب ہوئے کہ پنجاب میں ان خیالات کے مبلغ بن گئے جن کو پھیلانا سرسید کا مقصود تھا۔ میر حسن کی سرسید سے پہلی ملاقات میر حسن کے بیٹے ذکی شاہ کی روایت کے مطابق ۱۸۷۳ء میں ہوئی تھی۔ وہ ایم اے او کالج کی رسمِ تنصیب کی تقریب میں شرکت کے لیے ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ بھی آئے تھے۔ شیخ آفتاب احمد لکھتے ہیں کہ وہ پابندی سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں سرسید کی دعوت پر شریک ہوتے انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ سرسید کے اس دعوے "خدا دارم دلے بریاں زعشقِ مصطفیٰ دارم" کا بہترین ثبوت وہ واقعہ ہے جس کے مولوی صاحب مرحوم عینی شاہد تھے سرسید مرحوم کی زندگی کے آخری دن تھے اور مولوی صاحب کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لیے علی گڑھ میں تشریف فرما تھے۔ رات کو دیر تک کسی اہم مسئلہ کے متعلق گفتگو ہوتی رہی اور پھر دونوں بزرگ سو گئے۔ آدھی رات کے وقت مولوی صاحب کی آنکھ کھلی تو سرسید والے پلنگ کو خالی پایا مولوی صاحب کو کچھ تردد ہوا باہر نکل کر دیکھا سرسیدؒ برآمدہ کے ایک کونے میں کھڑے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے دعا کر رہے تھے کہ خدا ان کی قوم کو گمراہی سے بچائے اور اس نیک مرد کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے سرسید کے اس اخلاص کا مرحوم پر اس قدر اثر ہوا کہ تا دمِ مرگ وہ اُن کے مداح رہے۔ سرسید کی وفات کے بعد ان کی سال گرہ کے روز وہ پابندی سے حیاتِ جاوید کا مطالعہ کیا کرتے تھے اور یہ طریقہ سالِ وفات تک جاری رہا" سرسید سے میر حسن کے ذہنی ربط کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ روایاتِ اقبال کے مصنف کو میر حسن کے بیٹے سیدؒ ذکی شاہ نے قرآنِ مبین کا وہ نسخہ دکھایا تھا جس کے "ہر دو صفحے کے درمیان سفید اوراق لگے ہوئے تھے اور ان سفید اوراق پر مولوی سید میر حسن نے اپنے قلم سے جا بجا ان آیات کا ترجمہ لکھ رکھا تھا جو سرسید اپنے مضامین میں کرتے تھے۔ یہ قرآنِ پاک مولوی میر حسن کے تبرکات کے طور پر اب تک ان کے خاندان میں محفوظ ہے۔ ۱۸۹۵ء میں جب ایم اے او کالج فنڈ میں ایک کلرک نے غبن کیا تو اس کی تلافی کے لئے ملک گیر چندہ ہوا جس میں

سیّد میر حسن نے ۵عہ نے چندہ دیا۔ کہا جا سکتا ہے سرسیّد اور علی گڑھ سے اقبال کی ابتدائی شناسائی اقبال کے استاد سیّد میر حسن کی وساطت سے ہوئی اقبال کے ذوقِ علم کی تربیت میں میر حسن کا جو حصّہ ہے اس کا اعتراف اقبال نے کیا ہے ؎

مجھے اقبال اس سیّد کے گھر سے فیض پہنچا ہے　　پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

اقبال جب لاہور آئے تو یہاں گورنمنٹ کالج میں انھیں ٹامس واکر آرنلڈ سے تلمذ حاصل ہوا جو مشرقی علوم و معارف کے نکتہ داں تھے اور جو گورنمنٹ کالج لاہور آنے سے پہلے تقریبًا نو برس تک علی گڑھ کالج میں رہ چکے تھے اقبال انھیں اے کلیم ذرۂ سینائے علم سے خطاب کرتے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ "پروفیسر آرنلڈ کی علی گڑھ کالج میں امتیازی حیثیت تھی وہ سچے علم کے طالب اور علم دوست تھے۔ میں نے کالج میں انھیں کبھی انگریزی لباس میں نہ دیکھا وہ کالج میں عربی لباس میں آتے تھے۔ سر پر عمامہ بدن پر عبا وقبا اور پیروں میں سلیم شاہی جوتا اور ہاتھ میں موٹے دستے کی چھڑی لیے جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے ٹھیک وقت پر کالج آجاتے۔ کبھی کبھی تیسرے پہر مغرب سے قبل میرے کمرے میں آجاتے اور مجھے سیر کے لئے ساتھ لے جاتے۔ راستے میں پوچھتے کہ آجکل کیا کر رہے ہو جب بتاتا کہ فلاں موضوع پر لکھ رہا ہوں تو اس کے متعلق مجھ سے بحث کرتے اور بعض کتابوں کی نشاندہی کرتے میں نے اخوان الصفا میں جس کے بانی پروفیسر آرنلڈ تھے دو ایک مضمون پڑھے ایک مضمون میں نے سینٹ پال پر پڑھا اس دن سے لڑکے مجھے سینٹ پال کہنے لگے" پروفیسر آرنلڈ علی گڑھ کالج میں شبلی کے رفیق تھے ان کا معمول تھا کہ وہ نمازوں کے اوقات میں کالج کی مسجد کے دروازے پر آکر کھڑے ہو جاتے کہ طلباء نمازوں کی پابندی کریں۔ سرسیّد کی خواہش پر انھوں نے اپنی مشہور کتاب پریچنگ آف اسلام لکھی جس کا اردو ترجمہ اردو کے بہترین مترجم معتصم باللہ محمد ذکاء اللہ کے بیٹے عنایت اللہ نے کیا تھا۔ آرنلڈ تا عمر سرسیّد کے جادو کا شکار رہے۔ خوشی محمد ناظر نے لکھا ہے کہ وہ علی گڑھ کالج میں طلباء کو نیچرل شاعری کی ترغیب دیتے تھے

لاہور میں اقبال کے دوستوں میں محمد شاہ دین ہمایوں تھے جو پنجاب کے پہلے مسلمان تھے جو مغربی علوم کے حصول کے لیے انگلستان گئے تھے انھیں اسلامی فقہ میں مہارت حاصل تھی اور ۱۸۹۲ء میں جب کہ ان کی عمر ۲۶ سال تھی سرسید نے انھیں اس زمانے کی نہایت اہم تنظیم آل انڈیا محمڈن

ایجوکیشنل کانفرنس کا صدر بنایا تھا اقبال نے کہا تھا کہ ؎

اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی

تیری چنگاری چراغِ انجمن افروز تھی

اس کے علاوہ لاہور میں میاں محمد شفیع تھے جن کی توجہ اور کوشش سے یکم دسمبر ۱۹۲۰ء کو مسلم یونیورسٹی ایکٹ پاس ہوا تھا۔ انگریزی اخبار پنجاب آبزرور کے ایڈیٹر اور اردو کے مخزن کے مدیر شیخ عبدالقادر تھے جو سرسید کی عظمت کے معترف ہی نہیں تھے بلکہ جن کی خانقاہ اردو ادب کے اہلِ ذوق اور علی گڑھ کے شیدائیوں کا مرکز تھی۔ اس کے علاوہ اقبال کے ہم جلیسوں میں ناٹک ساگر والے نورالٰہی اور محمد عمر تھے۔ جوگی اور ناظر والے خوشی محمد ناظر تھے حکیم احمد شجاع تھے جنھوں نے بعد میں اقبال کے ساتھ درسی کتابیں مرتب کیں اور ان سب کا علی گڑھ حبیب اور یہ علی گڑھ کے نقیب اور اقبال کے دوست اور کرم فرما تھے۔

سرسید کے نورتنوں میں ڈپٹی نذیر احمد بھی تھے جنھوں نے ۱۹۰۰ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں اقبال کی زبان سے ان کی نظم "نالۂ یتیم" سنی، تو بے اختیار پکار اٹھے کہ "ان کانوں سے انیس و دبیر کے مرثیے سنے ہیں مگر اس پائے کی نظم کبھی سننے میں نہ آئی جو اثر اس نے میرے دل پر کیا ہے وہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا"۔ اسی زمانے میں آرنلڈ کی سفارش پر علی گڑھ کالج کے سابق استاد شبلی نے اقبال کی کتاب علم الاقتصاد کی زبان درست کی تھی۔ علی گڑھ تحریک کے نقیب فرشتہ صفت حالی کے لئے تو اقبال نے کہا ہی ہے۔

میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا   جاری ہے مرے لب پہ کلامِ حالی

۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو جب سرسید نے رحلت فرمائی تو سید میر حسن کی ایما سے اقبال نے تاریخِ وفات نکالی اور سورۂ آل عمران کے اس جز سے مادۂ تاریخ نکالا جس میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے لئے رب العالمین کی خوشنودی کا اظہار فرمایا گیا ہے اور جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہی موت دینے والا ہے وہی درجات بلند کرنے والا ہے اور وہی الزام اور بہتان تراشیوں سے پاک کرنے والا ہے فقیر سید وحیدالدین نے لکھا ہے کہ "ڈاکٹر اقبال نے اس آیت سے تاریخ وفات نکال کر سرسید کی شخصیت کا بڑا حسین اعتراف کیا ہے"۔

اقبال کے دل پر سرسیّد کے کردار کی پاکیزگی، ان کی دردمندی ان کی صاعقہ بردوش بصیرت اور ان کی جرأت اور بے خوفی کا کتنا اثر تھا اس کا اندازہ اس نظم سے ہوتا ہے جو ۱۹۰۲ کے مخزن میں "سیّد کی لوح تربت" کے عنوان سے شائع ہوئی جس میں "سرسیّد" کی شخصیت کے اساسی پہلوؤں کا بڑی خوبصورتی سے احاطہ کیا گیا ہے۔ یہی وہ نظم ہے جس میں بندۂ مومن، کا لفظ پہلی بار اقبال کے کلام میں آیا ہے، شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ "تخیل" کے کانوں نے سرسیّد کے مزار سے وہ صدائے پردرد سنی جس کی، اس دل سے جو مرحوم کے پہلو میں تھا توقع ہو سکتی تھی۔ سرسیّد زندگی میں کئی حیثیتوں کا جامع تھا اس کی لوحِ تربت سے وہ کلمات نصیحت شیخ محمد اقبال کی طبع رسا نے اخذ کئے ہیں جو زندگی کے مختلف مشاغل کے جامع ہیں"۔

سرسیّد اقبال کے تحت الشعور پر کتنے چھائے ہوئے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اقبال جب سخت علیل تھے اور سارا علاج بے سود ہو رہا تھا۔ سرسیّد خواب میں آئے۔ اقبال راس مسعود کو لکھتے ہیں "میں نے تمہارے دادا رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضور رسالت مآب کی خدمت میں عرض کر۔ میں اسی وقت بیدار ہو گیا اور کچھ شعر عرضداشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے کل ساٹھ شعر ہوئے لاہور آکر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی سی نظم ہے اگر کسی زیادہ بڑی مثنوی کا آخری حصہ ہو جائے تو خوب ہے! الحمدللہ اب ختم ہو گئی ہے۔ مجھ کو اس مثنوی کا گمان بھی نہ تھا بہرحال اس کا نام ہوگا پس چہ باید کرد اے اقوام شرق "ضرب کلیم" کی طباعت کے بعد اس کی کتابت شروع ہو گی"۔

سرسیّد کی علمی اور قومی خدمات اور ان کے زبردست تعلیمی مشن کی بدولت اقبال کے دل میں ان کی کتنی قدر و منزلت تھی اس کا اندازہ غلام احمد پرویز سے ان کی اس گفتگو سے بھی ہوتا ہے جس میں انھوں نے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ جاوید نامہ میں سرسیّد کا ذکر رہ گیا ہے مودود صابری علی گڑھ کے طالب علم تھے محض اقبال کی زیارت کے لئے جب لاہور گئے تو رخصت ہوتے وقت اقبال نے ان سے کہا کہ جب علی گڑھ پہنچو تو سرسیّد علیہ الرحمۃ کے مزار پر فاتحہ پڑھنا اور میرا اسلام پہنچا دینا۔

اقبال کا علی گڑھ کالج سے روابط کا ہمیں پہلا نقش ۱۹۰۷ء میں ملتا ہے۔ یہ کالج ہندوستانی تاریخ کے ایک عجیب دور میں معرض وجود میں آیا تھا جب روایت، جدت، مفاہمت

سیاست، معیشت، لسانی اور فرقہ وارانہ فسادات کے دیو پنجہ آزمائی کر رہے تھے اسی لئے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی دہائیاں شدید ذہنی الجھنوں اور جذباتی اذیتوں کا زمانہ تھیں کہ اسی اثنا میں علی گڑھ کالج کے انگریز اساتذہ کے خلاف جن کی توجہ اور دلچسپی سے ہاسٹل کی تنظیم اور کالج کی تعلیم نے ایک صورت پکڑی تھی۔ طلبائے کالج نے شورش بپا کر دی اس زمانے میں اقبال کیمبرج میں تھے لیکن ان کے جیسا خبیر و بصیر سخنور اس اہم مسئلہ سے صرف نظر کیسے کر سکتا تھا؟ انھوں نے علی گڑھ کالج کے نام کیمبرج سے ایک پیام بھیجا جس میں پہلی مرتبہ انھوں نے اس نظم میں علی گڑھ کالج کے طلبار کے توسط سے نژادِ نو کو مخاطب کیا ہے۔ یہ نظم پہلے جون ۱۹۰۷ء کے مخزن میں شائع ہوئی اس میں بارہ شعر تھے بانگ درا میں صرف سات شعر جزوی ترمیم کے ساتھ شائع ہوئے ہیں اس نظم میں کہا گیا ہے کہ شمع سحر بجھتے بجھتے یہ پیغام دے گئی ہے کہ سوز اور جلن اور ذوق و شوق اور درد و داغ سے زندگی کی تپش قائم رہتی ہے اور اسی سے کامیابی اور کامرانی حاصل ہوتی ہے یہاں ہمیشہ نامور رہنے کے لئے طلب اور سوز کی شرط لازم ہے اور یہ کہ ابھی شوق کو پختگی کا مقام حاصل نہیں ہوا ہے اور نشہ کی کیفیت ابھی ادھوری ہے یعنی انھوں نے اس نظم میں کہا ہے کہ انگریزوں کے خلاف شورش کا ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ اسی زمانہ میں لندن میں علی گڑھ کالج کے سابق پرنسپل تھیوڈر مارلیسن بھی موجود تھے وہ علی گڑھ کالج کے ہردلعزیز پرنسپلوں میں تھے۔ وہ جب یہاں سے رخصت ہونے لگے تو مولانا قاسم نانوتوی کے عزیز علی گڑھ کالج میں دینیات کے معلم مولانا عبداللہ انصاری نے ان کے بازو پر امام ضامن باندھا تھا۔ مارلیسن کی سفارش پر راس مسعود کو لندن میں ای ایم فاسٹر نے لاطینی کا درس دینا شروع کیا تھا۔ اقبال سے بھی مسٹر مارلیسن کے روابط تھے جس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے کشن پرشاد شاد کو لکھا تھا وہ لکھتے ہیں "سر تھیوڈر مارلیسن سکریٹری آف اسٹیٹ کی درخواست ہے کہ میں ایک مضمون تاریخ پر لکھوں یہ مضمون کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کا جو لکھی جا رہی ہے کا ایک باب ہوگا۔ سر تھیوڈر نے مجھ سے بڑے اصرار سے کہا ہے اور میں بسبب ان کی عنایات کے انکار نہیں کر سکتا یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ مارلیسن اور اسی طرح لندن میں علی گڑھ کے کچھ اور شیدائیوں کے زیر اثر اقبال نے طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام اپنا پیغام بھیجا ہے لیکن ۱۹۲۰ میں بھی جب علی گڑھ کے کچھ طلبار علی گڑھ کالج کو توڑنے کی اسکیمیں بنا رہے تھے اور اس سلسلے میں اُن کے ساتھی واویلا مچا رہے تھے اقبال نے کالج توڑنے کے خیال سے اتفاق نہ کیا۔ خان محمد نیاز الدین کو

وہ ایک خط میں لکھتے ہیں "اخباروں میں شائع ہوا ہے کہ اقبال نے قومی آزاد یونیورسٹی سے متعلق مدد دینے کا وعدہ کیا ہے یوں تو مسلمانوں کے معاملات میں اگر مجھ سے مدد طلب کی جائے تو مجھے تعمیلِ حکم میں کیونکر تامل ہو سکتا ہے تاہم جو کچھ اخباروں میں لکھا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ میرے ساتھ ان کی کوئی گفتگو اس بارے میں نہیں ہوئی ہے واقعات کی رو سے یہ بات بالکل غلط ہے اس خیال سے کہ علی گڑھ میں اس بیان سے لوگ دھوکہ نہ کھائیں میں نے ایک تار آنریری سکریٹری کو دیا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔"

سرسید کی وفات کے بعد علی گڑھ کالج کے طلباء ہی نے نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں نے سرسید کے یونیورسٹی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے کوششیں شروع کر دی تھیں۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں مسلمانانِ ہند کا محبوب مسئلہ مسلم یونیورسٹی کا قیام تھا۔ اس تحریک میں اقبال قلمے درمے، قدمے اور سخنے شریک تھے۔

۹ ستمبر ۱۹۰۸ کو علی گڑھ گزٹ نے لکھا "الحمد للہ کہ ہمدردانِ قوم روز بروز اپنی ضروریات کو زیادہ محسوس کرنے لگے ہیں اور اظہار خوشی و مسرت کا بہترین طریقہ اختیار فرماتے ہیں اور روپیہ کو عمدہ طرح صرف کر کے نیک مثال قائم کرتے ہیں ہم نہایت خوشی سے مولوی نظر محمد صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر اسکول امرتسر پنجاب کا نام نامی شکریہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں جنھوں نے فخرِ قوم ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی کی واپسی پر جو دعوت احباب کرنی چاہی تھی وہ ڈاکٹر اقبال صاحب موصوف کی خواہش پر ملتوی کی گئی اور اس کے صرفہ کے بقدر مبلغ چالیس روپیہ علی گڑھ کالج کو بھیجا جانا تجویز ہوا ہے جس کی اطلاع خود مولوی نظر محمد صاحب نے آنریری سکریٹری کالج کو دی ہے۔ خدا مولوی صاحب موصوف کو جزائے خیر دے اور ان کی نیک مثال کی ہر جگہ تقلید کی جائے۔ قومی ضروریات اس قدر زیادہ اور اہم ہیں کہ جب تک اسی قسم کی امداد عام ہو گی انکا پورا ہونا ممکن نہیں ہے۔ ترقی یافتہ قوموں میں اس قسم کی مثالیں بہ کثرت مل جاتی ہیں جس سے قومی زندگی کا پتہ چلتا ہے ہم مولوی نظر محمد صاحب اور ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کا پھر شکریہ ادا کرتے ہیں۔"

۲۴ فروری ۱۹۱۱ء کو آغا خاں کی قیادت میں ایک وفد جس میں وقار الملک، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں پشاور سے عبدالعزیز بیرسٹر بہار سے قاری شاہ سلیمان پھلواروی بنگال سے نواب نصیر حسین خاں خیال بمبئی سے آنریبل مولوی رفیع الدین وغیرہ شامل تھے۔ مسلم یونیورسٹی

کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے لاہور گیا اہالیان لاہور نے وفد کا زبردست خیر مقدم کیا۔ شہر میں بازاروں سڑکوں پر پچاس سے زائد خیر مقدمی محرابیں بنائی گئی تھیں بعض محرابوں پر سرسید کی بڑے سائز کی تصاویر آویزاں تھیں ایک عام مسلمان جو جلسہ گاہ کی آرائش میں معروف تھا انتظامیہ کے ایک ممبر نے اس کی کارکردگی سے متاثر ہو کر کہا کہ تمہیں تمغہ دیا جائے گا تو اس نے بر محل جواب دیا کہ ہمیں سوائے یونیورسٹی کے اور کوئی تمغہ درکار نہیں ہے۔ اس وفد کا استقبال کرنے والوں میں اقبال بھی تھے۔ برکت علی محمڈن ہال لاہور میں سر آغاخاں کی صدارت میں مسلم یونیورسٹی فنڈ کے سلسلے میں جو جلسہ ہوا تھا اس میں اقبال نے یہ رباعی بھی پڑھی تھی۔

باہر ہوئے جلتے ہو کیوں جامے سے ۔۔۔ پوچھو کسی پنڈت سے نہ علامے سے

میں تم کو بتاتا ہوں یونیورسٹی کیا ہے ۔۔۔ پتلون کی تکرار ہے پاجامے سے

اس سے پہلے اقبال ۱۹ فروری کو اہالیانِ لاہور کے ایک بڑے جلسہ میں مسلم یونیورسٹی کے قیام اور اس کی غرض و غایت کے بارے میں ایک تقریر کر چکے تھے۔ مجوّزہ مُسلم یونیورسٹی فنڈ میں چندہ دینے کے علاوہ اس کا دستور اور بائی لاز ترتیب دینے میں وہ شیخ عبدالقادر آنریبل حسن امام جسٹس شاہ دین ہمایوں سید کرامت حسین سید وزیر حسن میاں فضل حسین اور سر شاہ سلیمان کے شریک تھے۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی تحریک پر اقبال نے ۱۹۲۴ء میں مجوزہ شعبۂ اسلامیات میں اعلیٰ علوم اسلامی کی تحقیق کے لئے ایک نصاب تیار کیا تھا لیکن دینیات کے صدر مولانا سلیمان اشرف نے اس تجویز کو بروئے کار نہ آنے دیا۔ اقبال علی گڑھ کے ایک طالب علم فضل کریم کو ایک خط میں لکھتے ہیں "اگر آپ علم فلسفہ میں دلچسپی رکھتے ہیں تو آپ کو اپنی یونیورسٹی کے ارباب اختیار پر عربی زبان کے وسیع تر مطالعہ کی ضرورت پر زور دینا چاہیے کئی سال ہوئے میں نے مُسلم یونیورسٹی کو اسلامی علوم میں تحقیقی کام کرنے والے علماء تیار کرنے کا منصوبہ پیش کیا تھا لیکن بدقسمتی سے اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔"

اقبال علی گڑھ کے اردو فارسی اور فلسفہ کے شعبوں کے ایک عرصے تک اکسٹرنل ممبر رہے وہ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۵ تک شعبہ اردو کے ممبر تھے وہ ۱۹۲۴، ۱۹۲۵، ۱۹۳۲ اور ۱۹۳۷ء میں شعبۂ فلسفہ کے بورڈ آف اسٹڈیز کے رکن تھے ۱۹۳۵ء میں شعبۂ فارسی نے انھیں تین سال کے لیے اپنے شعبہ کا ممبر نامزد کیا تھا۔ وہ ۱۹۲۱ سے تادمِ آخر مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے ان کے دوسرے ساتھی ممبران کورٹ میں عبدالحلیم شررؔ،

امداد امام اثر سید سلیمان ندوی وغیرہ تھے۔

اقبال جامعات کے اعلیٰ امتحانات کے ممتحن بھی ہوتے تھے اور بڑی عرق ریزی سے کاپیاں جانچتے تھے عبدالرشید طارق لکھتے ہیں "کہ وہ بڑے غور سے ایک ایک لفظ پڑھتے جوابات پر کھتے پھر کہیں جاکر نمبر لگاتے"۔ اقبال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تین شعبوں اردو فارسی اور فلسفے کے پرچوں کے اکثر ممتحن رہے ہیں وہ ۱۹۳۴ اور ۱۹۳۵ میں ایم اے فارسی کے تیسرے پرچے کے ممتحن تھے وہ ۱۹۲۶ اور ۱۹۳۵ میں بی اے آنرز اور ایم اے فلسفہ کے پانچویں پرچے کے ممتحن تھے۔ اس زمانے میں اردو فارسی اور عربی کے پرچوں کے سوالات انگریزی میں دینے کا دستور تھا۔ اقبال نے مروّجہ ضوابط کے مطابق اردو کے پرچے انگریزی میں ترتیب دیئے۔ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر نے شکوہ کیا اور لکھا "ہمیں یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ ہماری یونیورسٹی میں اردو کے ایم اے اور آنرز کے سوالات انگریزی میں دیئے گئے۔ ستم یہ ہوا کہ یہ حرکت ان ذمہ دار ہستیوں سے سرزد ہوئی ہے جو اردو ادب کے چشم و چراغ ہیں اور جن پر ہماری قوم و ملک اور ادب سب کو فخر ہے۔ ہم نام نہیں لینا چاہتے ورنہ اردو ادب کے نام لیوا دیکھتے کہ اردو مضمون نویسی کے سوالات انگریزی میں دے کر اردو ادب کی توہین کرنے والا وہ شخص ہے جس کی غیر فانی شاعری نے کل کی نوخیز چھوکری یعنی اردو زبان کو السنہ عالم کی صف میں بٹھلا دیا ہے۔ اس موقع پر ہمیں "کسی" کا ایک شعر یاد آرہا ہے جسے ہم آج اسی کے سامنے التماس کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ کاش کہ یہ شعر جس نے ہزاروں کے جذباتِ خوابیدہ میں ہیجانی کیفیت پیدا کر دی ہے خود کہنے والے کے جذبات کو جگا سکتا۔

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا

۱۹۱۱ سے ۱۹۳۸ تک شاید ہی کوئی سال ایسا ہو جس میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور علی گڑھ میگزین میں اقبال کی تخلیقات اہتمام سے نمایاں طور پر اور بعض اوقات توصیفی کلمات کے ساتھ نہ شائع کی گئی ہوں۔ یہاں ۸ مارچ ۱۹۱۱ سے ۷ مارچ ۱۹۲۴ تک اقبال کی ان تخلیقات کی نشاندہی کی گئی ہے جو علی گڑھ گزٹ میں شائع ہوئیں۔

۸ مارچ ۱۹۱۱ - مسلمان بچہ کا قومی راگ۔

۱۰ جنوری ۱۹۱۲ - دعا

۱۷ر جنوری ۱۹۱۲ء۔ نوید صبح

۱۵ر مئی ۱۹۱۲ء۔ نغمۂ توحید

۲۹ر مئی ۱۹۱۲ء۔ نغمۂ نعت

۱۰ر جولائی ۱۹۱۲ء۔ دیکھتا ہوں دوش کے آئینہ میں فردا کو میں

۱۰ر ستمبر ۱۹۱۳ء۔ مسلمانوں کی فقید المثال رواداری

۲۲ر اپریل ۱۹۱۴ء۔ ہمارے اسلاف

۲۷ر مئی ۱۹۱۴ء۔ ایک آرزو

۱۷ر نومبر ۱۹۱۵ء۔ نوا را تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی

۲۶ر اپریل ۱۹۱۶ء۔ بلال رضؓ

۲۷ر نومبر ۱۹۱۸ء۔ ایثار صدیق رضؓ

۴ر دسمبر ۱۹۱۸ء۔ ترانۂ اقبال

۱۲ر فروری ۱۹۱۹ء۔ شارع آفتاب

۳۰ر مارچ ۱۹۲۲ء۔ اقبال کے عنوان سے اُن کے فارسی اشعار درج کئے گئے ہیں۔

۲۹ر مارچ ۱۹۲۳ء۔ مناجاتِ مسلم

۵ر مارچ ۱۹۲۳ء۔ فرمودۂ اقبال

۱۱ر مئی ۱۹۲۳ء۔ دریائے خلیل

۷ر مارچ ۱۹۲۴ء۔ سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

یہ فہرست مکمل نہیں ہے یوں تو گزٹ میں اقبال کا کلام تعریفی کلمات کے ساتھ شائع ہوتا تھا لیکن ۱۹۲۲ء میں گزٹ نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اقبال جن کو قدرت نے شاعر یا پروفیسر بنایا تھا وہ خود بیرسٹر بن گئے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ یہ دراصل مسلمانوں کے قومی ادبار کے حقیقی آثار ہیں۔ اگر ڈاکٹر اقبال اپنے قوائے فطریہ پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے تو یقین ہے کہ آج ٹیگور سے زیادہ مشہور ہوتے۔ اُردو کو چھوڑ کر ڈاکٹر صاحب فارسی کی طرف مائل ہوئے اور جس درجہ کامیاب رہے اس کا احساس ان کو خود بھی ہوگا اب وہی ڈاکٹر اقبال جو خود

ایک طرز کے موجد ہیں اکبر کی نقالی پر اترے ہیں نمونتاً چند اشعار درج ہیں۔

علی گڑھ کے عاشقوں کے ہیں یہ طور سارے نہیں اس کمیٹی کا کوئی ایجنڈا

تمہیں ہند سرمایہ دار و مبارک سلامت رہے مجھ کو نیچی یو گنڈا

میں ڈنڈے پہ شاکر تو انڈے پہ راضی مرا بیر ڈنڈا ترا پیر انڈا

علی گڑھ میگزین میں اقبال کا کلام برابر شائع ہوتا تھا۔ رشید احمد صدیقی کے زمانۂ ادارت میں اقبال کے فرمودات اہتمام سے شائع ہوئے خواجہ منظور حسین کی ادارت میں علی گڑھ میگزین کے جو شمارے نکلے ان میں اقبال کا کلام اور تصویر بھی شائع ہوئی لیکن ایک بار علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر زکریا فیاضی نے شکایت کی کہ اقبال نے میگزین کو اپنے تازہ کلام سے مفتخر نہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ہماری قوم کے قابلِ فخر شاعر جناب ڈاکٹر محمد اقبال صاحب یونیورسٹی میں تشریف لائے اور ایک ہفتہ تک قیام کیا۔ بہت سی دعوتیں اور پارٹیاں ان کے اعزاز میں دی گئیں طلباء بھی بلا تکلف علامہ موصوف سے سرگرم گفتگو ہوئے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ صاحب موصوف نے میگزین کے لیے اپنا تازہ کلام عنایت نہیں کیا۔ اسی زمانہ میں ایک بار رسالہ ہمایوں میں علامہ اقبال کے پانچ اشعار شائع ہوئے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علی گڑھ میگزین میں رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر اقبال جو خم فلسفی سے بہت کم باہر نکلتے ہیں۔ اس نمبر میں پانچ اشعار کے پردہ میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ اس 'تبرک' کا شکریہ کس کی خدمت میں پیش کیا جائے علامہ گم گشتہ کی یا میاں بشیر احمد کی۔"

اقبال کی وفات سے پہلے ہی علی گڑھ میگزین نے اقبال پر ایک خصوصی نمبر شائع کیا اس کے علاوہ اُن کی وفات کے بعد بھی علی گڑھ میگزین کی اشاعت اقبال کے نام سے منسوب کی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ میگزین نے اقبال پر جو دو نمبر پیش کئے ہیں ان کی حیثیت اقبال شناسی میں مستقل اور اہم ہے۔

اقبال تین دفعہ علی گڑھ آئے پہلی بار اُن کا ورود مسعود یہاں ۹ فروری ۱۹۱۱ کو ہوا۔ یہاں انھوں نے انگریزی میں وہ لیکچر دیا جسے بعد میں مولانا ظفر علی خاں نے اردو کا جامہ پہنایا اور ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر کے عنوان سے شائع ہوا۔ اگرچہ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء کے دوران جن فائنلوں

کو طلبائے کالج کے روبرو توسیعی خطبہ دینا تھا ان میں اقبال کے لکچر کا موضوع سلطنتِ برطانیہ تھا اس سلسلے میں علی گڑھ گزٹ میں یہ اطلاع ملتی ہے " مولانا خواجہ کمال الدین صاحب بی اے ایل ایل بی پلیڈر چیف کورٹ لاہور ۲۶ نومبر ۱۹۱۰ کو علی گڑھ تشریف لا کر طلبائے کالج کے سامنے اس مضمون پر لکچر دینے والے ہیں" شارع اسلام علیہ السلام بنی نوع انسان کی ہدایت اور رہبری کے لیے ایک عمدہ نمونہ ہیں" علاوہ ازیں مندرجہ ذیل اصحاب نے بھی نہایت مہربانی سے سال ۱۱-۱۹۱۰ کے اندر طلبا کے کالج کے روبرو لکچر دینے کا وعدہ فرمالیا ہے لکچروں کی ٹھیک تاریخ کا اعلان صاحب پرنسپل کالج کی جانب سے بعد میں ہوگا۔

۱- مسٹر ایس فرینک - ہندوستانی ریلوں پر

۲- مسٹر ڈبلو ایس میرس (مضمون کا اعلان بعد میں ہوگا)

۳- آنریبل مسٹر سیّد علی امام - گورنمنٹ ہند کے نظام پر

۴- خان بہادر سید محمد ہادی اسسٹنٹ ڈائریکٹر زراعت صنعت شکر سازی پر بذریعہ ماڈلز

۵- شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی ہندوستان کی تہذیب پر۔

۶- ڈاکٹر محمد اقبال صاحب - سلطنتِ برطانیہ پر۔

۷- مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی ابوبکر صدیق رض پر

۸- صفدر علی انجینئر آبپاشی پر بذریعہ ماڈلز

۹- مولانا شبلی نعمانی اسلامی تاریخ لٹریچر اور مذہب کے متعلق کسی مضمون پر

۱۰- مولانا محمد عزیز مرزا صاحب - اردو لٹریچر پر

۱۱- مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی - چند آیاتِ قرآنیہ پر

۱۲- مولانا مولوی سبطِ حسن مجتہد لکھنؤ - توحید باری پر

۱۳- مولانا خواجہ کمال الدین صاحب - قرآن مجید کی اخلاقی تعلیم پر۔

اقبال نے ۹ فروری ۱۹۱۱ کو اسٹریچی ہال میں جو انگریزی لکچر دیا اس کا اصل عنوان بتایا جاتا ہے لیکن ایس اے رحمٰن کی روایت کے مطابق اس کا عنوان ہے

اس خطبہ میں اقبال نے فرمایا کہ مسلمانوں کو اپنی تاریخ سے واقف ہونے اور اپنے مذہب کی سختی سے پابندی کرنے کی اشد ضرورت ہے اور یہ بھی کہا کہ اگر اسلامی شعار سے آزاد ہو کر ہمارے نوجوان خواہ کیسی ہی دنیاوی ترقی کر جائیں تاہم اپنے مذہب اور قوم کے لئے وہ باعثِ فخر نہیں ہو سکتے "۔ لکچر ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین نے اقبال کا شکریہ ادا کیا اور حاضرین کے پیہم اصرار پر اقبال نے اپنے خاص انداز میں اپنا مشہور ترانہ اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا سُنایا اور اسی بانگ درا کو بعد میں انھوں نے اپنے پہلے شعری مجموعہ کا عنوان بنا دیا۔ علی گڑھ والے اس ترانے سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے ایک خوش الحان طالب علم کو اس ترانے کو ریکارڈوں میں بھرنے کے لئے کلکتہ بھیجا اور دی گراموفون کمپنی کلکتہ نے اسے مسلم یونیورسٹی ریکارڈ کے نام سے جاری کیا۔ اور فروخت شدہ ریکارڈوں کی قیمت مجوزہ مسلم یونیورسٹی فنڈ میں دی گئی۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ جلسہ کسی کی صدارت میں ہوا اور نہ علی گڑھ میں اقبال کے قیام اور مصروفیات کا سُراغ لگا۔

دوسری بار اقبال ڈاکٹر ظفر الحسن صدر شعبۂ فلسفہ کی دعوت پر RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM.. کے خطبات دینے یہاں تشریف لائے تھے اس کے تین خطبے تو مدراس میں ۱۹۲۹ء کے اوائل میں وہ دے چکے تھے لیکن باقی تین خطبے جو بعد میں مکمل ہوئے پہلی بار علی گڑھ میں دیئے گئے ان خطبات کا ایک خطبہ کے اضافہ کے ساتھ سیّد نذیر نیازی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اقبال ۸ / نومبر ۱۹۲۹ کی دوپہر میں عبداللہ چغتائی جو مشہور مصوّر عبدالرحمٰن چغتائی کے بھائی تھے کے ساتھ علی گڑھ پہنچے۔ اسٹیشن پر اساتذہ اور طلباء نے ان کا زبردست خیر مقدم کیا۔ اتنی گلپوشی ہوئی کہ وہ پھولوں میں چھپ گئے تھے۔ اسٹیشن سے وہ یونیورسٹی کی بگھی میں گھوڑ سواروں کے دستے کے ساتھ یونیورسٹی آئے ان کا قیام ڈاکٹر ظفر الحسن صدر شعبۂ فلسفہ کے مکان پر تھا۔ وہ ہفتہ بھر یہاں رہے جس میں ایک روز ڈاکٹر بٹ کے یہاں قیام رہا۔ راس مسعود، ڈاکٹر ضیاء الدین خواجہ غلام السیّدین ڈاکٹر ظفر الحسن عبدالمجید قریشی اور کرنل بشیر حسین زیدی نے اُن کے اعزاز میں ڈنر اور چائے کی دعوتیں دیں وہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور رشید احمد صدیقی کی عیادت کو بھی گئے۔ رشید صاحب لکھتے ہیں۔ " اس روز مجھے

خاص طور پر بڑی تکلیف بھی مشکل سے باہر آیا میں نے بڑی مایوسی کے ساتھ رُک رُک کر کہا ڈاکٹر صاحب کاش میں اتنا بیمار نہ ہوتا کہ آپ کے دوسری جگہ قیام کرنے کی مایوسی اور شرمندگی اٹھانی پڑتی ہائے اُن کا وہ چونک کر لیکن فوراً ہی مسکرا کر بڑے وقار اور شفقت سے اپنے مخصوص لہجے میں فرمانا نہیں جی! صدیقی صاحب کوئی بات نہیں اللہ اپنا فضل کرے گا اچھے ہو جاؤ گے پھر لاہور آنا۔ مایوس کیوں ہوتے ہو؟ مایوس ہونے سے جانتے ہو ایمان میں خلل پڑتا ہے اور اس سے اللہ کریم کی توہین ہوتی ہے۔ اچھے مسلمانوں کو اس کی احتیاط رکھنی چاہیئے اس کے بعد دیر تک اسی انداز کی گفتگو کرتے رہے کہ میں ان کی موجودگی میں یہ بھول گیا کہ بیمار بھی تھا۔"

خطبات کے سلسلے میں پہلا جلسہ ۱۹ ر نومبر ۱۹۲۹ کو ساڑھے چھ بجے شام اسٹریچی ہال میں ڈاکٹر ظفر الحسن کی صدارت میں اور وائس چانسلر راس مسعود کے خیر مقدمی کلمات کے ساتھ شروع ہوا اور آٹھ بجے تک جاری رہا یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء کی بڑی تعداد موجود تھی طالب علم خطبے کے نکات نوٹ کرنے کے لئے قرطاس وقلم لے کر آئے تھے لیکن خطبہ کا مضمون خاصا دقیق تھا اس لئے تکان دور کرنے کے لئے کلام کی فرمائش ہوئی۔ اقبال نے کہا کہ "آپ لوگ کب تک شعر و شاعری کے دلدادہ بنے رہیں گے میں شاعر ضرور ہوں لیکن عام شعرا جیسا نہیں میں نے جو کچھ لکھا ہے چھپ چکا ہے۔ اسے پڑھ لیجئے۔ ملک و ملت انتہائی نازک دور سے گزر رہے ہیں اور جو اہم مسائل درپیش ہیں وہ سخت محنت اور غور و فکر کے طالب ہیں وقت آگیا ہے کہ دماغی عیاشی کے تمام رجحانات ترک کر دیئے جائیں میں اس سفر میں اپنا کلام پڑھنے نہیں آیا ہوں"۔ یہ کہہ کر ڈائس سے اُتر گئے۔ اقبال کے باقی پانچ خطبات رامپور حامد ہال میں ہوئے اس عرصہ میں وہ علی گڑھ کی علمی دنیا کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ راس مسعود ڈاکٹر ضیاء الدین عبدالعزیز میمن بے نظیر شاہ وارثی ڈاکٹر خلیل مراد وغیرہ سے یونیورسٹی کے ترقیاتی منصوبوں اور علمی مسائل پر گفتگو رہی۔ کئی سوسائیٹیوں نے انھیں اپنے یہاں مدعو کیا۔ پرو وائس چانسلر ای اے ہارن نے اعتراف کیا کہ "یہ ہفتہ اس قدر پُر از واقعات رہا کہ ہم نے یا یونیورسٹی نے اب تک نہ دیکھا ہوگا۔"

اقبال تیسری مرتبہ اسپشل کانوکیشن میں شرکت کے لئے ۸ ر دسمبر ۱۹۳۴ء کو علی گڑھ آئے اس سے پہلے ۱۹۲۴ میں اکیڈمک کونسل اور یونیورسٹی کی مجلس منتظمہ نے اقبال کو اعزازی ڈگری

دینے کی تجویز منظور کر لی تھی لیکن علالت کے سبب وہ ۱۹۲۴ء کے کانوکیشن میں شریک نہ ہو سکے۔ اسی تجویز کو بحال رکھا گیا اور ۲۲ دسمبر ۱۹۳۴ء کے اسپیشل کانوکیشن میں اقبال اور راس مسعود کو ایکٹنگ وائس چانسلر نواب اسمٰعیل نے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری پیش کی سر شاہ سلیمان نے کانوکیشن ایڈریس دیا۔ اس دوران اقبال کی مصروفیات کا علم نہیں ہوتا اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے گلے کی تکلیف شروع ہو چکی تھی نذیر نیازی لکھتے ہیں کہ "۱۸ دسمبر کو جب حضرت علامہ علی گڑھ جاتے ہوئے دہلی سے گزرے اور میں دہلی اسٹیشن پر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کی صحت کہیں سے کہیں پہنچ چکی تھی"۔

علی گڑھ کی بہار کے آخری پھولوں میں مولوی عبدالحق، راس مسعود اور سجاد حیدر یلدرم بھی تھے جنھوں نے علیگی کی آنکھیں دیکھی تھیں ان سب سے اقبال کے گہرے روابط تھے۔

مولوی عبدالحق کی اردو تحریک کے بارے میں اقبال نے لکھا ہے کہ آپ کی تحریک اس تحریک سے کسی طرح کم نہیں جس کی ابتدا سر سید رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی۔ اقبال اور عبدالحق کے روابط کی ابتدا کب ہوئی اس کا سراغ نہیں ملا لیکن ۱۹۱۳ء میں جب انجمن ترقی اردو کی پہلی مجلس شوریٰ کی تشکیل ہوئی تو اقبال اس کے رکن تھے۔ اس کے علاوہ اقبال انجمن کی ادبی کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ وفات سے چند مہینے قبل اقبال نے مولوی عبدالحق کو جو خط لکھا ہے وہ سارٹن کی مقدمہ تاریخ سائنس کے اردو ترجمے سے متعلق ہے ۱۹۳۶ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس کے موقع پر یوم اردو بھی منایا گیا تھا۔ اس جلسہ کی صدارت عبدالحق نے کی تھی" اس موقع پر اقبال نے ان کی دعوت کی۔ مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ اقبال دن ہی میں کھانا کھا لیتے تھے رات کو نہیں کھاتے تھے اور برعکس اس کے مولوی عبدالحق صرف رات کو کھانا کھاتے تھے اقبال نے عبدالحق کی خاطر اپنا پروگرام بدل دیا اور ان کے ساتھ شریک طعام رہے"۔ اقبال مولوی عبدالحق کو ایک خط میں لکھتے ہیں" کاش میں اپنی زندگی کے باقی دن آپ کے ساتھ رہ کر اردو کی خدمت کر سکتا۔ مولوی عبدالحق کو اقبال ایک اور خط میں لکھتے ہیں" اردو زبان کے تحفظ کے لیے جو کوششیں آپ کر رہے ہیں اُن کے لیے مسلمانوں کی آئندہ نسلیں آپ کی شکر گزار ہوں گی مگر آپ سے زیادہ اس بات کو اور کون سمجھ سکتا ہے کہ زبان کے بارے میں سرکاری امداد پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ زبانیں اپنی اندرونی قوتوں سے نشوونما پاتی ہیں اور نئے نئے خیالات اور جذبات کے ادا کر سکنے پر ان کی بقا کا انحصار ہے آپکی کوششوں کا مرکز وہی پروگرام ہونا چاہیے جو آپ علی گڑھ میں وضع کر چکے ہیں"۔ اقبال اپنے اور

عبدالحق کے مشترک دوست راس مسعود کی رحلت پر ان کو لکھتے ہیں "مسعود مرحوم کا اخلاص اس کی دردمندی اور اس کا اخلاق جس میں اس کے باپ اور دادا دونوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ اب ہندوستان میں یہ باتیں کہاں نظر آئیں گی" عبدالحق نے راس مسعود اور اقبال کی رحلت پر انجمن ترقی اردو کے رسالہ اردو کا خصوصی نمبر شائع کیا۔ کسی اور رسالے کے اس پائے کے نمبران دونوں پر شاید ہی اردو میں نکلے ہوں۔

اقبال کے انگلستان روانہ ہونے کے ایک سال بعد راس مسعود عازم ولایت ہوگئے میرا خیال ہے کہ انگلستان کے زمانہ قیام میں اقبال کے تعلقات راس مسعود سے استوار ہوئے۔ اس خیال کو تقویت راس مسعود کی اِس تحریر سے ہوتی ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ لندن میں میرے باکمال دوست سر محمدؐ اقبال سے یہ درخواست کی گئی کہ شعراء کی بابت اپنا خیال ایک البم میں تحریر کریں۔ سر محمدؐ اقبال نے یہ جملہ تحریر کیا

NATIONS ARE BORN IN THE LAP OF POETS BUT THEY GROW

AND DIE IN THE LAP OF POLITICIANS.

اسی زمانہ میں تمدن عرب اور تمدن ہند کے مترجم سید علی بلگرامی بھی لندن میں تھے جن کا مکان علی گڑھ اور دوسرے ہندوستانی طلبہ کی تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور جہاں اقبال برابر آتے جاتے تھے۔ سید علی بلگرامی کا علی گڑھ تحریک سے گہرا تعلق تھا وہ جس زمانے میں تمدنِ ہند کا ترجمہ کر رہے تھے تو صبح اُٹھ کر پہلے حیاتِ جاوید کے چند اوراق پڑھتے تھے اور پھر ترجمہ شروع کرتے۔ جب سر سیّد نے آخری بار حیدرآباد کا سفر کیا اور بشیر باغ میں نظام حیدرآباد کے مہمان رہے۔ سید علی بلگرامی سر سیّد کو اپنے مکان پر لے گئے اور اپنے ذخیرۂ کتب سے نادر اور بیش بہا کتابیں دکھانی شروع کیں۔ ان میں ایک کتاب ایسی بھی تھی جس میں شروع سے آخر تک اسپین کے اسلامی عہد کی عمارات کے نقشے اور تصویریں تھیں۔ سر سید نے اس کتاب کو بہت پسند کیا اور فرمایا کہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ علی گڑھ کالج کی لائبریری کی زینت بنے تاکہ مسلمان عبرت حاصل کریں۔ رخصت ہوتے وقت سیّد علی بلگرامی نے وہ کتاب سر سیّد کی گاڑی میں رکھ دی۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ لندن میں سیّد علی بلگرامی کے گھر پر راس مسعود کی ملاقات اقبال سے ہوئی ہوگی۔

جب راس مسعود علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوگئے تو علی گڑھ سے اقبال کی دلچسپی

بڑھی اور دونوں کے تعلقات میں اور گہرائی آئی اقبال عبدالماجد دریابادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں
"میں بھی ایک ہفتہ کے لئے علی گڑھ گیا تھا وہاں ایک نئی زندگی کا آغاز، معلوم ہوتا ہے سید راس مسعود
بہت مستعد آدمی معلوم ہوتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کی مساعی سے یونیورسٹی کی زندگی میں ایک خوشگوار
تبدیلی پیدا ہوگی۔ آپ بھی کبھی کبھی وہاں جایا کریں اور مذہبی مضامین پر طالب علموں سے گفتگوئیں کیا
کریں تو نتائج بہت اچھے ہوں گے۔ باوجود بہت سی مخالف قوتوں کے جو ہندوستان میں مذہب کے
خلاف (اور بالخصوص اسلام کے خلاف) اس وقت عمل کر رہی ہیں مسلمان جوانوں کے دل میں اسلام
کے لئے تڑپ ہے لیکن افسوس کہ کوئی آدمی ہم میں نہیں جس کی زندگی قلوب پر موثر ہو۔"

والئ افغانستان شاہ محمد نادر خاں کی دعوت پر جب راس مسعود علی گڑھ سے ۱۹ اکتوبر
۱۹۳۳ء کو ڈاکٹر ہادی حسن کے ساتھ روانہ ہوئے اور لاہور پہنچنے پر شب میں شیخ عبدالقادر کے مہمان رہے اور
یہاں ۲۰ اکتوبر کی صبح کو اقبال بھی لاہور سے اُن کے ساتھ ہو گئے۔ شام کو پشاور پہنچے جہاں رات میں
سر عبدالقیوم کے ہاں ان لوگوں کا قیام رہا۔ ۲۱ اکتوبر کو پشاور سے اس قافلہ کے ساتھ سید سلیمان
ندوی بھی ساتھ ہو گئے اور جلال آباد سے ہوتے ہوئے یہ لوگ ۲۶ اکتوبر کی صبح کابل پہنچے۔ کابل
سے آٹھ میل پہلے اس وفد کا نہایت گرم جوشی سے استقبال ہوا جس میں وزیر و دبیر شامل تھے۔ ان
لوگوں کا قیام ایوان دارالامان میں رہا۔ والئ افغانستان نے ایک اعلیٰ درجہ کا قالین یونیورسٹی
کو اور ایک قلمدان راس مسعود کو تحفتاً دیا اور تین سو روپیہ ماہوار کی دوامی گرانٹ یونیورسٹی
کے لئے منظور کی جہاں جہاں وفد کی تقریریں ہوئیں ان میں راس مسعود نے اردو میں تقریر
کی وفد کی واپسی براہ قندھار کوئٹہ اور چمن ہوئی۔ ڈاکٹر ہادی حسن اور راس مسعود ۹ نومبر کی صبح کو علی گڑھ پہنچے۔ اسی سفر میں
یہ واقعہ پیش آیا کہ "اقبال اور راس مسعود ایک محفل میں جمع تھے۔ راس مسعود کی طبیعت کو چہل
سوجھی تو وہ ڈاکٹر صاحب سے بولے کہ آج ہم دونوں کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ رہے گا مگر
اس شرط کے ساتھ کہ آج ہم اشعار شاعر مشرق ہی کے سنائیں گے۔ کسی دوسرے شاعر کے اشعار
قبول نہیں کئے جائیں گے .... مگر رفتہ رفتہ اقبال کے شعر سنانے کی رفتار دھیمی پڑتی چلی گئی یہاں
تک کہ ڈاکٹر صاحب کو اپنے شعر یاد کرنے میں بڑی تلاش اور غور و فکر سے کام لینا پڑا مگر راس مسعود
کے حافظہ اور یادداشت کا یہ عالم تھا کہ وہ پوری روانی کے ساتھ علامہ اقبال کے اشعار سنائے

جاتے تھے اور کسی طرح ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ آخر کار اقبال نے فیصلہ اپنے دوست سر راس مسعود کے حق ہی میں دیا اور اس بات کا اعتراف کیا کہ انھیں اپنے شعر اتنے یاد نہیں جتنے سر راس مسعود کو یاد ہیں اور وہ (اقبال) ان (راس مسعود) کی حاضر جوابی برجستہ گوئی اور اقبال شناسی کے آگے سپر انداختہ ہیں۔" اس سفر میں راس مسعود اور اقبال ایک دوسرے کے بہت قریب آئے اور دونوں کے تعلقات میں اتنی گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی کہ اقبال نے جب اپنا وصیت نامہ مرتب کیا تو راس مسعود کو اپنے بچّوں کا متوّلی بنانا چاہا۔ راس مسعود نے جواب میں لکھا " تمہارا خط مورخہ ۱۰ر جون ابھی تین بجے میں نے بغور پڑھا چونکے گارجین کی بابت میری رائے یہ ہے کہ چونکہ میں لاہور میں رہتا ہوں اور نہ کوئی اُمید لاہور کے قریب رہنے کی ہے تو مجھے مقرر نہ کرو بلکہ کسی ایسے دوست کو جو کم سے کم پنجاب ہی میں مقیم ہوں البتہ اپنی وصیّت میں یہ ضرور لکھو کہ اگر گارجین کو کسی معاملہ میں جہاں تک منیرہ سلمہا اور جاوید سلمہٗ کی تعلیم کا تعلق ہے۔ کوئی مالی دقت پیش آئے تو پہلے مجھ مطلع کیا جائے کیونکہ جب تک کہ ان دونوں کی انشاءاللہ بائیس برس کی عمر نہ ہو جائے میں ہر ممکن طریقے سے مدد دینے کیلئے تیار ہوں بشرطیکہ میں خود زندہ رہا یہ خود ایک بڑی ذمہ داری میں اپنے اوپر اس عشق کے ثبوت میں لے رہا ہوں جو مجھے تم سے ہے یہ ضرور کرنا کہ میرے متعلق اس سلسلہ میں جو الفاظ اپنے وصیت نامہ میں درج کرو جو کہ رجسٹرار کے پاس محفوظ کر رہے ہو۔ ان کی نقل میرے پاس ضرور بھیج دینا۔ اگر خدانخواستہ ضرورت پیش آئی تو یقین رکھو کہ تمہارے ان دونوں بچّوں کیلئے ان کی تعلیم کے مسئلہ میں وہی کروں گا جو اپنی اولاد کیلئے یہ ضرور صلاح دیتا ہوں کہ جہاں تک جائیداد وغیرہ کا تعلق ہے اس کا انتظام اپنے سامنے ہی ایسا کر دو کہ کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے۔" اقبال نے راس مسعود کو جب ملکی سیاست میں حصّہ لینے کا مشورہ دیا تو راس مسعود نے جواب دیا کہ میں فروغ تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کو بہت عزیز رکھتا ہوں اور ان کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں کسی ملک میں تعلیم کے بغیر سیاسی سرگرمیاں بڑے خطرناک انجام سے دوچار ہو سکتی ہیں۔ سیاست کے ساتھ علم و دانش ضروری ہے۔ اقبال نے راس مسعود کے خیال کو سراہا وقت کے ساتھ ساتھ دونوں کی دوستی اور محبت بڑھتی گئی یہاں تک کہ اقبال نے راس مسعود کو اپنا دوسرا گھر کہا اور جب اقبال کی علالت نے طول پکڑا تو راس مسعود کے توسط سے نواب حمید اللہ خاں

والیٔ بھوپال نے جو علی گڑھ کے طالب علم تھے انھیں مالی پریشانیوں سے بے نیاز کر دیا۔ اقبال اپنے علاج کے سلسلے میں کئی بار بھوپال آئے اور راس مسعود کے مکان ریاض منزل میں بھی قیام کیا۔ اقبال نے "اپنے خطوں میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ سر راس مسعود کے یہاں رہ کر انھیں کس قدر ذہنی سکون اور قلبی آرام میسّر آتا تھا۔" مارچ ۱۹۳۷ء میں جب راس مسعود کی بیٹی نادرہ مسعود پیدا ہوئی تو اقبال نے قطعۂ تاریخ کہا۔

راس مسعود جلیل القدر کو | جو کہ اصل و نسل میں مجدد ہے
یادگار سیدِ والا گہر | نورِ چشمِ سیدِ محمود ہے
راحتِ جان و جگر دخترِ ملی | شکرِ خالق منتِ معبود ہے
خاندان میں ایک لڑکی کا وجود | باعثِ برکاتِ لامحدود ہے
کس قدر برجستہ ہے تاریخ بھی | باسعادت دخترِ مسعود ہے

اقبال کی شاعری کے اوّلین زمانے میں جب اہلِ زبان ان کو نئے رنگ میں ابھرتا دیکھ کر ان کے کلام میں زبان کی خامیوں پر نکتہ چینی کرتے اور محاورے کی غلطیوں کو اچھال اچھال کر خوش ہوتے اس زمانے میں علی گڑھ کے طالب علموں کی ایک بڑی تعداد اقبال کے کلام کی عاشق گرویدہ اور حافظ رہی ہے اقبال شروع سے علی گڑھ کے محبوب ترین شاعر رہے ہیں انکے آگے یہاں کسی کا چراغ نہ جل سکا۔ اقبال کے پرستاروں میں سجاد حیدر یلدرم بھی تھے اور غالباً ان کی قدر شناس نظروں نے سب سے پہلے اقبال کی شاعرانہ عظمت کو بے نقاب دیکھا تھا وہ اپنی تحریر "اردو کا نیا شاعر اقبال" میں لکھتے ہیں۔

"ہمیں خوشی اور کشادہ دلی سے ماننا چاہیئے کہ اردو کو ایک شاعر ملا ہے جس کی آواز ہر روز لطیف تر، جس کا نغمہ ہر آن شیریں اور جس کا تخیل ہر لمحہ بلند تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ تنگ دلی یہ بچوں کا سا رشک یہ ایک شخص کی خداداد قابلیت کے اعتراف سے آنا کیوں ہے؟ اگر ایک عندلیب خوش نوا دفعتاً کسی شاخ گل پر بیٹھ کر ایسی جاں آویز اور دلگداز نغمہ سنجی شروع کر دیتی جو اور عنادل میں نہیں تو میں خیال کرتا ہوں کہ اور ہم صفیرانِ چمن اس نغمے کو سنتے ہیں اور اس نئے صفیر کا دلی مسرت سے خیر مقدم کرتے ہیں مگر ہمارے باغِ سخن کے عنادل کسی نو عمر عندلیب کا ایسا نغمہ، جو ان کے نغمے سے بدرجہا بالاتر ہے بغیر رشک کے

نہیں سن سکتے! تعجب ہے اور افسوس!" یہ تحریر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی اور جہاں تک میرے علم میں ہے سجاد حیدر یلدرم کی اس تحریر سے اقبال کی شاعری کے افکار و علائم پر غور و خوض کا آغاز ہوتا ہے مولانا محمد علی، عبدالرحمٰن بجنوری، مولانا عبدالرزاق راشد مرتب کلیاتِ اقبال اور مولانا اسلم جیراج پوری وغیرہ جو سب کے سب علی گڑھ کے ہیں ان کے اقبال پر مضامین اس کے بعد کے ہیں اقبال سے یلدرم کی ارادت ان کے اس خط سے بھی ظاہر ہے جو سجاد حیدر نے علی گڑھ گزٹ کو ۱۹۱۱ میں لکھا تھا۔

" مجھے یقین ہے کہ اقبال نے آپ کے قلب کو انھیں حیات سے متحس کر دیا ہوگا جس سے کہ میرے آپ کے اور دو مردوں کے قلب ہی میں تلاطم نہیں ہے بلکہ آسمانِ شاعری کے اس تازہ ہلال نے الحمدللہ کہ وہ اب بدر کامل ہو رہا ہے۔ اسلامی عمان ہندوستان کو متحرک کر رکھا ہے۔ اس بربط نواز نے ہر قلب کے اس تار کو اپنی جادو بھری مضراب سے چھیڑا ہے جہاں تک سوائے حالی کے کسی کی مضراب نہ پہنچی تھی۔ پری شاعری کے چہیتے اقبال نے پھر اپنے خم و ساغر بانٹنے شروع کئے ہیں اور اک جہان ہے کہ مست ہو رہا ہے۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس ساحر کی سحر طرازی کا اعتراف کریں۔ میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ دہلی کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں اقبال کے گلے میں قوم کی طرف سے ہار پہنایا جائے۔ ہائے وہ وقت کہ دہلی میں شاعروں کے منہ موتیوں سے بھرے جاتے تھے اور اگر کاش مولانا حالی اس پیرانہ سالی اور ضعیف الحالی میں دہلی تشریف لا سکیں اور اپنے مبارک ہاتھوں سے اقبال کو ہار پہنائیں تو مجھے امید ہے کہ شاگرد حالی (اقبال) اسے اپنی سب سے بڑی عزت سمجھیں گے۔ اس طرح دہلی کی خاک پر اقلیم ادب میں ایک یہ مبارک رسم بھی ادا کی جائے۔ مرحوم جہاں آباد میں اس رسم کا ادا ہونا کیا لطف دے گا۔ کون اہلِ ذوق ہے اور صاحب طبع سلیم ہے جو اس نظارے پر اشک ریز مسرت نہ ہوگا۔ میں نے ایک عریضہ اس بارے میں مسٹر محمد علی ایڈیٹر کامریڈ کی خدمت میں مع اس درخواست کے بھیجا ہے کہ وہ اس عریضہ کو کامریڈ میں شائع فرما کر اپنی تائید سے اس تجویز کی وقعت بڑھائیں۔ میں جناب کی تائید کا بھی متمنی ہوں خاص کر اس لئے بھی آپ کا اخبار باقاعدہ طور پر نواب وقارالملک

بہادر کی نظر سے گزرتا ہے۔" علی گڑھ گزٹ نے اس تجویز کی پُرزور تائید کرتے ہوئے لکھا

"ہم اس تحریک کا تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ اقبال عرصہ ہوا کہ قبولِ عام کی مسند پر متمکن ہو چکے ہیں اور چند روز کی خاموشی جو ان کے وسیع حلقۂ مداحین پر سخت گراں تھی اس کے بعد انھوں نے جس بلند آہنگی کے ساتھ قومی راگ الاپنا شروع کیا ہے اس نے بلاواسطہ اور بالواسطہ (بذریعہ صدائے بازگشت) اسلامی دنیا کو ہمہ تن گوش بنا رکھا ہے۔ قوم کی جانب سے سوزِ اقبال کا اقبال ہونا نہ صرف قوم کی قدر شناسی اور اقبال کی قدر افزائی کا باعث ہوگا بلکہ عجب نہیں کہ اس سے موجودہ جمود میں حرکت پیدا ہو اور کوئی زمانہ استقبال ایسے ایسے اور اقبالوں کا بھی استقبال کر سکے۔"

۱۹۱۱ء میں دہلی میں جب آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پچیسواں اجلاس ہوا تو اس کے تیسرے جلسے کی صدارت اقبال نے فرمائی اس جلسے میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے سالانہ رپورٹ پڑھی اور وقت کی تنگی کے سبب صرف مسلم یونیورسٹی کی تکمیل کے سلسلے میں حصے پڑھے اسی جلسہ میں خواجہ کمال الدین وکیل لاہور نے "اسلام اور علوم جدیدہ" کے عنوان سے ایک لکچر دیا اور اس لکچر پر صدر جلسہ اقبال نے ان الفاظ کے ساتھ تبصرہ کیا "خواجہ صاحب نے جو تقریر اس وقت کی ہے وہ نہایت دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں نے اس مبحث پر بہت کچھ لکھا ہے کہ اسلام اور علوم جدیدہ کے مابین کیا تعلق ہے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلام مغربی تہذیب کے تمام عمدہ اُصولوں کا سرچشمہ ہے۔ پندرہویں صدی عیسوی میں جب سے کہ یورپ کی ترقی کا آغاز ہوا یورپ میں سائنس کا چرچا مسلمانوں ہی کی یونیورسٹیوں سے ہوا تھا۔ ان کی یونیورسٹیوں میں مختلف ممالک یورپ کے طلبہ آکر تعلیم حاصل کرتے اور پھر اپنے اپنے حلقوں میں علوم و فنون کی اشاعت کرتے تھے۔ کسی یوروپین کا یہ کہنا کہ اسلام اور علوم یکجا جمع نہیں ہو سکتے سراسر ناواقفیت پر مبنی ہے اور مجھے تعجب ہے کہ علوم اسلام اور تاریخ اسلام موجود ہونے کے باوجود کوئی شخص کیونکر کہہ سکتا ہے کہ علوم اور اسلام ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

بیکن ڈیکارٹ اور مل یورپ کے سب سے بڑے فلاسفر مانے جاتے ہیں جن

کے فلسفے کی بنیاد تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہے۔ حالت یہ ہے کہ ڈیکارٹ کا اصول امام غزالی کی احیاء العلوم میں موجود ہے اور ان دونوں میں اس قدر تطابق موجود ہے کہ ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے کہ اگر ڈیکارٹ عربی جانتا ہوتا تو ہم ضرور اعتراف کرتے کہ ڈیکارٹ سرقہ کا مرتکب ہوا ہے راجر بیکن خود ایک اسلامی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا۔ جان اسٹورٹ مل نے منطق کی شکل اول پر جو اعتراض کیا ہے بعینہٖ وہی اعتراض امام فخر الدین رازی نے بھی کیا تھا۔ مل کے فلسفے کے تمام بنیادی اصول شیخ بو علی سینا کی مشہور کتاب "شفا" میں موجود ہیں غرض یہ کہ وہ تمام اصول جن پر علوم جدیدہ کی بنیاد ہے مسلمانوں کے فیض کا نتیجہ ہیں بلکہ میرا دعویٰ ہے کہ نہ صرف علوم جدیدہ کے لحاظ سے بلکہ انسان کی زندگی کا کوئی پہلو اور اچھا پہلو ایسا نہیں ہے جس پر اسلام نے بے انتہا روح پرور اثر نہ ڈالا ہو۔"

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پچیسویں اجلاس کے چھٹے جلسے کی صدارت مولانا قاری شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے فرمائی اس جلسہ میں سجاد حیدر یلدرم نے کانفرنس کی جانب سے اقبال کو ہار پہنانے کی تحریک کی مولانا شبلی نے گلپوشی کی رسم ادا کی اور تین نعرہ ہائے تحسین بلند کئے گئے۔ شبلی نے جلسہ کو ان الفاظ سے خطاب کیا "یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں ہے اور اس کو بالخصوص تفریح تصور نہ کرنا چاہیئے۔ ہم مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطابات کی قدر کرتے رہے ہیں اتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے ناموں کی نہیں ہوئی۔ محقق طوسی وغیرہ کو اس زمانے کے سلاطین نے بڑے بڑے خطابات دیئے لیکن آج سوا کتابوں کے اوراق کے کسی کی زبان پر نہ چڑھ سکے لیکن قوم کی طرف سے محقق کا جو خطاب دیا گیا تھا وہ آج تک زبان زد خاص و عام ہے۔ جو عزت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے وہ ان کے لئے بڑی عزت اور فخر کی بات ہے اور حقیقت میں وہ اس عزت کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کا علم ادب اور اُن کی شاعری کا مقابلہ غالب کی شاعری سے کیا جائے تو مبالغہ نہیں ہو سکتا۔" اقبال نے اس عزت افزائی کے لئے قوم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا "میری نظموں کے متعلق بعض ناخدا ترس لوگوں نے غلط باتیں مشہور کر رکھی ہیں اور مجھ کو پان اسلامزم کی تحریک پھیلانے والا بتلایا ہے۔ مجھ کو پان اسلامسٹ ہونے کا اقرار ہے اور میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہماری قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے اور جو مشن اسلام کا اور ہماری قوم کا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہیگا۔

شرک اور باطل پرستی دنیا سے مزور مٹ کر رہے گی اور اسلامی روح آخر کار غالب آئے گی اِس مشن کے متعلق جو جوش اور خیال میرے دل میں ہے اپنی نظموں کے ذریعہ قوم تک پہنچانا چاہتا ہوں اور اس اسپرٹ کے پیدا ہونے کا خواہشمند ہوں جو ہمارے اسلاف میں بھی کہ باوجود دولت و امارت کے وہ اس دارِ فانی کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے میں جب کبھی دہلی آتا ہوں تو میرا یہ دستور رہا ہے کہ ہمیشہ حضرت نظام الدّین محبوب الٰہیؒ کے مزار پر حاضر ہوا کرتا ہوں میں نے ابھی ایک شاہی قبر پر الملک للّٰہ کا کتبہ لکھا ہوا دیکھا اس سے اس اسلامی جوش کا اظہار ہوتا ہے جو دولت اور حکومت کے زمانے میں مسلمانوں میں تھی۔ جس قوم اور جس مذہب کا یہ اصول ہو اس کے مستقبل سے ناامیدی نہیں ہوسکتی اور یہی وہ پان اسلامزم ہے جس کا شائع کرنا ہمارا فرض ہے اور اس قسم کے خیالات کو میں اپنی نظموں میں ظاہر کرتا ہوں"۔ اس کے بعد اقبال نے اپنی نظم بلادِ اسلامیہ میں ،مدینۃ الرّسول سے متعلق چند اشعار سنائے اور آخر میں شاہ سلیمان پھلواری نے اپنے خطبۂ صدارت میں اقبال کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

سجّاد حیدر یلدرم اقبال کو قوم کے لئے رحمتِ پروردگار سے کم نہ سمجھتے تھے۔ اقبال کو بھی سجّاد حیدر سے گہرا لگاؤ تھا جس کا اظہار ان خطوط سے ہوتا ہے جو اقبال نامہ میں شامل ہیں۔ سجّاد حیدر کی ایماء سے اقبال نے اسلامی علم الانساب پر بڑا فاضلانہ تبصرہ کیا ہے جو مکتوب کی شکل میں قسطنطنیہ یونیورسٹی کے اسلامی علم الانساب کے پروفیسر خالد بے کے نام ہے اور اقبال نامہ کی دوسری جلد میں شامل ہے۔ جس زمانے میں سجّاد حیدر شعبۂ اردو کے اعزازی صدر تھے اقبال شعبہ کی بورڈ آف اسٹڈیز کے نامزد رکن تھے۔

علی گڑھ میں شعبۂ فلسفہ کے صدر ڈاکٹر ظفر الحسن بھی تھے جنھیں اقبال کی ذات سے گہرا تعلق تھا انھوں نے شبان المسلمین، کی ایک جامع اسکیم اقبال کو پیش کی تھی یہ اسکیم برطانوی حکومت سے آزادی حاصل کرنے سے متعلق تھی اس میں علی گڑھ کے کئی استاد شریک تھے اس تنظیم سے انھوں نے گہری دلچسپی لی! اس کے علاوہ دونوں کو اسلامی فلسفے سے گہرا شغف تھا یہی وجہ ہے کہ جیتے جی ڈاکٹر ظفر الحسن کی روح اور شعور میں اقبال کی شخصیت فروزاں رہی۔

علی گڑھ کے شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر ہادی حسن بھی اقبال کے گرویدہ تھے وہ افغانستان کے سفر میں راس مسعود اور اقبال کے ساتھ تھے اقبال نے ہادی حسن کی کتاب کتاب Persian Naiga tion پر دیباچہ بھی لکھا ہے۔

علی گڑھ میں شعبۂ سنسکرت کے استاد پنڈت حبیب الرحمٰن شاستری بھی اقبال کی محبت کے تار میں بندھے ہوئے تھے انھوں نے فلسفۂ جمالیات پر سنسکرت ماخذوں سے استفادہ کرکے اردو میں فلسفۂ انبساط کے نام سے پہلی کتاب لکھی اور شائع کی اور کتاب کا انتساب اقبال کے نام ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے۔

"چونکہ اس کتاب کا تعلق ایک طرف شاعری اور دوسری طرف فلسفہ سے ہے لہٰذا میں اس کتاب کو ہندوستان کی مُسلّمہ مایہ ناز ہستی یعنی ڈاکٹر سر محمد اقبال کے نام نامی کے ساتھ معنون کرنے کا فخر حاصل کرتا ہوں جن کی ذاتِ والاصفات میں علاوہ دیگر اعلیٰ خصوصیات کے شاعری اور فلسفہ کو خاص طور پر قدرت نے اعلیٰ پیمانے پر مجتمع کیا ہے۔"

شعبۂ اردو علی گڑھ کے نامور استاد رشید احمد صدیقی کا دل بھی اقبال نے موہ لیا تھا۔ اقبال کی شاعری رشید احمد صدیقی کے تخیل کو کس طرح گرماتی تھی اس کا اندازہ ان کے اسلوب سے ہوتا ہے جس کا ایک اہم ماخذ اقبال کی شاعری ہے۔ رشید احمد صدیقی اپنی ملازمت کے ابتدائی دنوں ۱۹۲۴ء میں اقبال سے ملنے لاہور گئے۔ علی گڑھ گزٹ نے خبر دی۔

"مسلم یونیورسٹی کی انجمن اردوئے معلّٰی کے سکریٹری مولوی رشید احمد صدّیقی ایم۔ اے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی شاعری پر ایک مبسوط تبصرہ لکھ رہے ہیں جس کی ضمن میں انھیں ڈاکٹر صاحب سے ملنا اور بعض متعلقہ امور کی نسبت استفسار کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب موصوف لاہور گئے اور ڈاکٹر صاحب سے ملے۔ قیام لاہور کے زمانے میں وہاں کے اسلامیہ کالج کے منتظمین کی خواہش پر ۲۵ رنومبر کو زبانِ اردو پر لکچر دیا۔ واپسی میں ۲۷ نومبر کو دہلی یونیورسٹی میں ڈاکٹر اقبال کی شاعری پر لیکچر دیا اور ان موقعوں پر مُسلم یونیورسٹی میں اردو زبان کے متعلق جو کچھ ہو رہا ہے اس کو اور یہاں کی انجمن اُردوئے معلّٰی کے لائحۂ عمل کو واضح کیا یہ دونوں لیکچر دلچسپی سے سُنے گئے۔"

رشید احمد صدیقی اقبال سے اپنی پہلی ملاقات کے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"غالباً دن کے نو دس بجے ہوں گے، لاہور مرحوم کی کوٹھی پر پہنچا، کپڑے پہن کر کسی مقدمے کی پیروی میں جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ سیاہ عقدہ (بو) باندھتے کالر درست کرتے ہوئے برآمد ہوئے، گٹھا ہوا جسم، چوڑی چکلی ہڈیاں، مردانہ انداز، آنکھوں کی ساخت اور

مونچھوں کی وضع کسی قدر تورانیوں جیسی، سوٹ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ مسکرانے میں آنکھوں کے گوشوں میں جھرّیاں پڑتی تھیں جن سے ذکاوت و محبّت کا اظہار ہوتا تھا۔ بڑی خوش دلی اور شفقت سے ہاتھ ملایا اور کسی قدر دیر تک ہاتھ میں ہاتھ لئے رہے۔ بھاری بھر کم لہجے میں بولے آپ ہیں جی صدیقی صاحب! میں اقرار کرتا ہوں کہ مرحوم کا ڈیل ڈول اور حلیہ دیکھ کر متحیر اور مرحوم کے انداز تخاطب اور لہجہ سے کسی قدر متعجب، اتنے میں نوکر کو آواز دی اور پنجابی میں قلم لانے کو کہا ق کا تلفظ سُن کر پھر پریشان سا ہوا۔ علی گڑھ میں پنجابی تلفظ سے آشنا ہو چکا تھا لیکن ذہن میں معلوم نہیں کیوں یہ بات جم گئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال اس طرح کی معذوری سے مستثنیٰ ہوں گے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ پہلے سے بنائی ہوئی بہشت کو یوں درہم برہم ہوتے ہوئے دیکھ کر مجھ پر جو اثر جس درجہ ہونا چاہیئے تھا وہ نہ ہوا۔ مرحوم کچھ اس انداز سے ملے اور اب محسوس کرتا ہوں کہ خود ان کے تلفظ میں کچھ ایسا خلوص اور اُن کے ہاتھ ملانے میں وہ شفقت اور ناقابلِ بیان مروّت و مرحمت تھی کہ سب کچھ بھول گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اقبال ایسے نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا۔ جیسے ایک نیا تجربہ بڑا اچھا تجربہ حاصل ہوا جس کا میں مستحق ضرور تھا گو منتظر نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے لئے کمرہ میں بیٹھے۔ علی گڑھ کا حال دریافت فرماتے رہے۔ آواز بھاری تھی اور بلند ہونے کے ساتھ ساتھ زور اور صفائی بڑھتی جاتی۔ میں نے اس خود اعتمادی کے ساتھ جس میں عالمانہ اور والہانہ دونوں انداز متوازی و متوازن ہوں کم لوگوں کو گفتگو کرتے سُنا ہے۔ مرحوم کی باتیں سُنیئے بشرطیکہ وہ بات کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو فوراً محسوس ہوگا کہ ان کی باتیں صرف زبان سے نہیں ادا ہوتیں وہ صرف الفاظ اور فقروں پر بھروسہ نہیں کرتے تھے بلکہ وہ باتیں کہیں دور سے اور بڑی گہرائی سے آتی تھیں۔ گفتگو حشو و زوائد سے قطعاً پاک ہوتی اور بحث اتنی واضح اور جامع ہوتی کہ وضاحت و جامعیت بجائے خود صنائع و بدائع معلوم ہونے لگتی تھیں۔ گفتگو کرنے میں ان کی آنکھیں نصف سے بھی کچھ کم کھلی رہتیں۔ البتہ جب گفتگو میں گرمی اور روانی پیدا ہو جاتی تو آنکھیں پوری کھل جاتی تھیں اور چہرے پر گرمی و روشنی کے آثار نظر آنے لگتے تھے۔"

اس صدی کے اوائل سے علی گڑھ کے طالب علموں کے قلوب پر اقبال کی مکمل حکمرانی

تھی ۱۹۳۵ میں جب اقبال بیمار پڑے تو ممنون حسن خاں کا بیان ہے کہ "دریافت صحت کے لیے سب سے زیادہ خطوط علی گڑھ کے طلبار اور اساتذہ کے ہوتے تھے" اقبال سے اس شیفتگی کا اظہار طلبار کی یونین کلب میں بھی ہمیشہ ہوتا رہا ہے اس یونین کی اہمیت کا اندازہ اپنے زمانے کے سحبان وائل عطار اللہ شاہ بخاری کے اس فقرے سے ہوتا ہے کہ لاہور سے چلا تو احباب نے کہا کہ اگر علی گڑھ کے مسلمانوں سے خطاب کرنا ہے تو شہر کی جامع مسجد میں تقریر کرنا اور پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو خطاب کرنا ہے تو یونیورسٹی یونین میں تقریر کرنا۔ یہاں کی یونین نے اپنی خدمات کی ایک قیمتی روایت قائم کر دی تھی یہاں اعلیٰ علمی مباحث ہوتے رہتے تھے اقبال بھی ۱۹۱۲ء سے یونین کا موضوعِ گفتگو رہے ہیں ۲۴ فروری ۱۹۱۲ کو یہاں ایک مباحثہ ہوا جس کا عنوان تھا "توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ ۶ جنوری ۱۹۳۶ کو ایک ڈبیٹ ہوا۔ نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی موافقت میں مباحثہ کا آغاز سردار جعفری نے کیا اور چودہ منٹ بولے اور مخالفت میں آل احمد سرور نے سولہ منٹ تقریر کی۔ ۳ مارچ ۱۹۳۶ کو ایک اور مباحثہ ہوا۔ موضوع تھا۔ آئندہ سیاسی حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہندوستان کو ٹیگور کی نہیں اقبال کی ضرورت ہے رشید صاحب نے جلسہ کی صدارت کی۔ ۵ مارچ ۱۹۳۶ کو ایک مباحثہ ہوا عنوان تھا جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی صدیق احمد صدیقی نے مباحثہ کا آغاز کیا۔

تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کے خطبات دینے اقبال ۱۹۲۹ میں جب علی گڑھ آئے تو ۲۰ نومبر کو آٹھ بج کر بینتالیس منٹ پر اقبال کا یونین ہال میں روایتی شان سے استقبال ہوا شعبۂ قانون کے سابق پروفیسر حفیظ الرحمٰن سکریٹری تھے اور وائس پریسیڈنٹ قاضی غیاث الدین سپاسنامہ میں کہا گیا کہ "ہمارے الفاظ اس ذاتِ گرامی کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہیں جس نے مسلمانوں میں خود احترامی کے احساسات پیدا کرنے میں اپنے عہد کے ہر شخص سے بڑا اور نمایاں حصہ لیا ہے آپ ہمارے لیے وہ سب کچھ لے کر آگے بڑھے ہیں جو ہمارے شاندار ماضی کا خاصہ تھا ہمیں آپ کی شاعری نے متحیر کر دیا ہے ہمیں اس جیسی کوئی بات اساتذہ کے کلام میں تلاش کرنے میں ناکامی ہوتی ہے۔ مسلم یونیورسٹی یونین میں آج آپ کی آمد ایک تاریخی واقعہ قرار پائے گی۔

اور بعد میں آنے والی نسلیں آپکو اپنے قابلِ تعظیم اسلاف میں شمار کریں گی۔"

سپاسنامہ کے جواب میں اقبال نے کہا کہ" ایک دوسری بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ ہمارا انکشاف ماضی ہے میں ان لوگوں میں نہیں جو صرف ماضی سے محبّت کرتے ہیں میں تو مستقبل کا معتقد ہوں مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لیے ہے کہ میں حال کو سمجھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان گم گشتہ رشتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعہ سے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ رہیں۔" انھوں نے یہ بھی کہا کہ" اگر خدا نے توفیق دی اور فرصت ہوئی تو میں ایک دن کا مل تاریخ اس بات کی قلمبند کردوں گا کہ دنیائے جدیدہ اس مطمح حیات سے کس طرح ترقی کرتی ہوئی بنی ہے جو قرآن شریف نے ظاہر کیا ہے۔ میں اُمیّد کرتا ہوں کہ یونیورسٹی ایسے لوگوں کی ایک تعداد پیدا کردے گی جو مطالعۂ قرآن میں اپنی زندگیاں صرف کردیں گے میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ میرے ساتھ مل کر کام کریں آخر میں اقبال نے یہ بھی کہا کہ" گذشتہ چند سال سے میں صرف اپنے جسدِ خاکی کا مالک ہوں لیکن میری روح ہمیشہ آپ کی خدمت کے لئے حاضر رہی ہے اور جب تک میں زندہ ہوں وہ آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔" اقبال کے دل و دماغ پر علی گڑھ کے طلباء کس طرح چھپائے رہتے تھے اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو لندن جاتے ہوئے انھوں نے ایڈیٹر وطن کو لکھا تھا لکھتے ہیں۔" تھوڑی دیر کے بعد مصری نوجوانوں کا ایک نہایت خوبصورت اور صحت مند گروہ جہاز کی سیر کے لئے آیا میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کے چہرے اس قدر مانوس معلوم ہوتے تھے کہ مجھے ایک سیکنڈ کے لئے علی گڑھ کالج کے لڑکوں کا شبہ ہوا۔"

یونین کے اسی جلسے میں اقبال کو یونین کا لائف ممبر بنایا گیا تھا۔ اسی تعلیمی میقات میں یونین میں گاندھی جی بھی تشریف لائے تھے اور یونین میں اُنھیں سپاسنامہ بھی پیش کیا گیا تھا اور لائف ممبر بناتے ہوئے مہمانوں کی کتاب پر لکھا گیا تھا کہ

علی گڑھ میں گاندھی جی کی آمد کی خبر دیتے ہوئے علی گڑھ میگزین نے لکھا ۳ر نومبر ۱۹۲۹ کو ملک کے مشہور رہنما مہاتما گاندھی یونیورسٹی میں جلوہ افروز ہوئے اور یونین کی عمارت میں ان کی نصیحت آمیز تقریر ہوئی۔ سید راس مسعود صاحب (وائس چانسلر) نے مہاتما جی کا تعارف کراتے ہوئے ان کی ایثار و قربانی کا تذکرہ کیا یونین کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور مشتاق طلباء گاندھی جی کو دیکھنے کے لئے بے چین تھے بہت زور کے ساتھ اُن کا خیر مقدم ہوا"۔

اس سال یونین میں واشنگٹن یونیورسٹی کے پروفیسر رابرٹس پیرس، رسالہ اسلامک ورلڈ کے ایڈیٹر محمود خاں، سر مالکم ہیلی اور نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر ایم کے جے کار اور سر شاہ سلیمان بھی تشریف لائے تھے۔

۱۹۳۸ میں جب اقبال کا انتقال ہوا تو علی گڑھ کے لئے یہ حادثہ ایک گہرے ذاتی صدمے کا باعث ہوا۔ علی گڑھ کے ایک طالب علم محمد سعید لکھتے ہیں کہ "اقبال کی موت نے آناً فاناً یونیورسٹی سے اس کی تمام رونقیں اور قہقہے چھین لئے چارسو ماتم اور سوگواری تھی۔ اس کی زندگی ملّتِ اسلامیہ کے لئے جتنا بڑا سہارا تھی موت اسی قدر بے آسرا ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ ہفتوں یہ کیفیت رہی کہ جب دستر خوان پر بیٹھتے اور ہم میں سے کوئی اقبال کا ایک آدھ مصرعہ غیر ارادی طور پر بھی پڑھ دیتا تو نوالہ حلق میں اٹک کے رہ جاتا اور کھانا کھائے بغیر دستر خوان بڑھا دیا جاتا بالخصوص سر آمد روزگارے ایں فقیرے دگر دانائے راز نے تو پہروں رُلایا ہے۔ طلباء کی اکثر محفلیں غمناک ہو گئیں"۔

اقبال کی وفات کے بعد بھی یہاں اقبال کے فکر و فن ان کی تصانیف اور ان کی تعلیمات کے مطالعے کا سلسلہ اُستوار رہا۔

۱۹۳۹ میں علی گڑھ میگزین کا اقبال نمبر پروفیسر الیف۔ جے فیلڈن کے زیر نگرانی اور محمد سلطان الاسلام کی ادارت میں شائع ہوا۔ اس خصوصی نمبر میں اقبال کے فکر و فن پر امیا چکرورتی امرناتھ جھا، ڈاکٹر موہن سنگھ، خواجہ غلام السیدین اور سید حامد سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے مضامین لکھے۔ اس خصوصی نمبر کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ پیغام بھیجا۔

TO INSPIRE US. HE LIVES IN HIS WORK, IQBAL WAS ONE OF THE CHOICE SPIRITS OF THE AGE IN INDIA AND THE WORK HE LEFT BEHIND WILL KEEP HIM ENSHRINED IN THE LOVING MEMORY OF HIS PEOPLE.

اپریل ۱۹۴۸ میں ظفر احمد صدیقی سابق صدر شعبۂ فلسفہ نے اقبال کے نام سے علی گڑھ سے ایک ماہنامہ کا اجراء کیا۔ اس رسالہ کا مقصد علامہ اقبال کے پیغام کی اشاعت تھا اس نمبر میں اقبال کا ایک خط بھی شامل ہے جو انھوں نے ظفر احمد صدیقی کی نظم "نذر اقبال" کے جواب میں لکھا ہے اس رسالے کے صرف چھ شمارے شائع ہوئے۔ اب ۱۹۷۸ میں یہاں سے پروفیسر اسلوب احمد انصاری سابق صدر شعبۂ انگریزی کی ادارت میں ایک ششماہی رسالہ نقد و نظر بھی نکل رہا ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر شمارے میں اقبال پر کوئی مضمون ہوتا ہے۔ اس رسالے نے کئی اقبال نمبر بھی شائع کئے ہیں اور اس رسالے یہاں اقبال کی تفسیر و توضیح کا کام جاری ہے ۱۹۴۱ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ پونا کے اجلاس میں علی گڑھ کے طالب علم مختار احمد آزاد کی یہ تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی کہ اقبال کی یادگار میں ایک ہوسٹل اقبال ہوسٹل کے نام سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں قائم کیا جائے اور اس میں علامہ اقبال کی تحریک اور شاعری سے خاص دلچسپی رکھنے والے طلباء کیلئے سہولتیں مہیا کی جائیں تقریباً چالیس برس بعد اس تجویز نے عملی جامہ پہنا اور سید حامد سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقبال اور علی گڑھ سے عشق نے یہاں اقبال ہاسٹل کے بجائے علامہ اقبال ہال تعمیر کرا دیا۔

علی گڑھ میں ڈاکٹر ظفر الحسن ڈاکٹر ذاکر حسین خواجہ غلام السیدین، رشید احمد صدیقی، شیخ عطاء اللہ خواجہ منظور حسین آل احمد سرور مسعود حسین خاں اور اسلوب احمد انصاری اقبال کے ارادتمندوں میں ہیں ان سب نے اقبال کی تصانیف کے عرفان کو عام کرنے اور اسے علی گڑھ کے قافلے میں لٹانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اقبال کے تعلیمی فلسفے پر خواجہ غلام السیدین نے IQBAL'S EDUCATIONAL PHILOSOPHY کے عنوان سے انگریزی میں ایک کتاب شائع کی۔ خواجہ منظور حسین نے اقبال اور دوسرے شعرا کے عنوان سے اقبال صدی کے دوران نہایت دقیع کتاب لکھی۔ اسلوب احمد انصاری کی کتاب اقبال کی تیرہ نظمیں

اور مسعود حسین خاں کی کتاب اقبال کی علمی اور نظری شعریات پر ساہتیہ اکیڈمی نے اپنا انعام پیش کیا۔

مسعود حسین خاں کی اقبال سے دلچسپی طالب علمی کے زمانے سے تھی۔ انھوں نے جب علی گڑھ میں تدریس کے فرائض انجام دیئے تو انکا خاص پرچہ اقبال تھا۔ انھوں نے علی گڑھ کی کئی نسلوں کو اقبال کے فکر وفن کے نگارخانوں سے آشنا کرانے میں نمایاں رول ادا کیا ہے رشید احمد صدیقی نے اقبال پر اپنے مضامین میں جو ان کے رسالہ سہیل میں شائع ہوئے اقبال کے کلام اور پیام کی جامعیت پر زور دیا اور علی گڑھ کی پانچ نسلوں کو اقبال کا گرویدہ بنا دیا۔ ذاکر حسین نے جامعہ ملیہ کے رسالے جوہر کے اقبال نمبر کو یہ پیغام دیا: "اس کا (اقبال) کلام ایک ایسا جامع پیام ہے کہ اگر ہمارے نوجوان اسے سمجھ لیں اور اس پر کاربند ہوں تو شاید ہماری ملت کے دن پھر جائیں"۔

آل احمد سرور نے اقبال پر اپنے بہت سے انگریزی اور اردو مضامین اور خطبات کے ذریعہ ان کی امنگوں اور آرزوؤں کی تفہیم کی شیخ عطاء اللہ نے ۴۳ء۱۹ میں اقبال کے خطوط جمع کرنے کا بیڑا اٹھایا وہ اپنے ایک گشتی مراسلے میں لکھتے ہیں۔

"علامہ ممدوح کی وفات کو قریباً پانچ سال کا عرصہ ہو چکا ہے لیکن ان کے افکار کی اشاعت کے سلسلے میں ایک ضروری کام ابھی تک محتاج توجہ ہے۔ علامہ ممدوح کے مکاتیب کی جمع وترتیب اور اشاعت ایک طرف تو اس مرد آگاہ اور دانائے راز کے افکار کی اہمیت سمجھنے کیلئے اور دوسری طرف شعر وادب مذہب وتاریخ، فلسفہ عالمگیر تحریکاتِ حالیہ پر تبصرہ اور ملکی واسلامی سیاست میں بصیرت حاصل کرنے کے لئے بے حد اہم ہے مسلمانانِ ہند کی محسن شناسی کی یہ ایک ناقابلِ معافی گناہ ہوگا۔ اگر علامہ ممدوح کے مکاتیب کو اسلامی ہندوستان کی آئندہ نسلوں کیلئے محفوظ کرنے کا اہتمام نہ کر لیا گیا۔

پانچ سال کے صبر آزما انتظار کے بعد اور علامہ مرحوم کے چند مخلصین کے بیہم اصرار پر میں نے قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند کے مصداق علامہ ممدوح کے مکاتیب کی جمع وترتیب اور اشاعت کا کام شروع کر دیا ہے۔ اللہ کے فضل وکرم سے امید ہے کہ مرد درویش کی یہ یادگار جس کا تحفظ اس کے مطبوعہ افکار کی طرح ضروری ہے۔ ایک دن پوری دلآویزی

کے ساتھ اقبالنامہ کے عنوان سے شائع ہو سکے گی۔

آپ کی علم دوستی اور ملّت پروری سے توقع ہے کہ آپ اس تجویز کو پسند اور اس فریضہ ملّی کی انجام دہی میں اس ناچیز کی امداد فرمادیں گے جس کی صورتیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) اگر آپ کے پاس علامہ اقبال کا کوئی خط یا کسی قسم کی کوئی تحریر محفوظ ہو تو از راہِ کرم خاکسار کو عاریتاً بہ صیغۂ رجسٹری بھیجی جائے اور بعد نقل بحفاظت تمام واپس بھیج دی جائیگی یا اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی طرف سے دوسرے مجموعہ مکاتیب کے ساتھ جو میں مہیّا کر رہوں آپ کے مکاتیب بھی مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں پیش کر کے آئندہ نسلوں کے لئے اس قومی سرمایہ و امانت کو محفوظ کر دیا جائے۔ (۲) اگر آپ کے حلقۂ احباب میں ایسے بزرگ ہیں جن کے پاس علامہ اقبال کے مکاتیب موجود ہونے کی اُمید یا امکان ہے تو ان کے مفصل پتے خاکسار کو قریب ترین فرصت میں مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ ان بزرگوں سے براہِ راست عطیہ مکاتیب کے لئے درخواست کی جاسکے۔ امید ہے آپ اپنے ایسے احباب کو اس پر مائل بھی فرمادیں گے کہ وہ خاکسار کو علامہ اقبال کے مکاتیب کی نقل حاصل کرنے کی اجازت دیں (۳) اگر آپ کے علم میں علامہ ممدوح کے ایسے مکاتیب ہیں جو کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہو چکے تو از راہِ کرم ایسے اخبارات یا رسائل یا کتب کا مفصل حوالہ مرحمت فرمائیے تاکہ انھیں حاصل کیا جاسکے۔"

اس رسالے میں بعض تنظیموں کا تفصیل سے ذکر نہیں کیا جا سکا جیسے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جس نے اقبال کو ترجمانِ حقیقت کا خطاب دیا اور جو زبان زد عام و خاص ہو گیا۔ علی گڑھ کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا بھی ذکر ضروری تھا جس کے لئے خاص طور پر اقبال نے وہ نظم کہی تھی جس میں کہا گیا تھا۔

تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارا

علی گڑھ کالج کے اِس اعتراف کا ذکر بھی ضروری تھا کہ اُس نے ۱۹۱۲ میں اقبال کے نام پر مڈل قائم کیا یہ تمغہ ۱۹۱۳ میں کالج کے طالب علم اور بعد کے مشہور ماہرِ معاشیات ایاس برنی کو ملا جن کی کتاب علم المعیشت کے بارے میں ۱۹۱۷ میں

اقبال نے لکھا تھا کہ "آپ کی تصنیف اُردو زبان پر ایک احسانِ عظیم ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ اُردو زبان میں علم اقتصاد پر یہ پہلی کتاب ہے اور ہر پہلو سے کامل"۔ علی گڑھ کالج کا اقبال مڈل ۱۹۱۹ میں ذاکر حسین بعد کے صدرِ جمہوریہ ہند نے حاصل کیا تھا۔

علی گڑھ اور اقبال کے سلسلہ میں یہ معروضات نہ مبسوط ہیں اور نہ مفصل لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ علی گڑھ کے تناظر میں اقبال کے فکر و فن کے بازیافت کی باقاعدہ کوشش کی جائے۔

....

اقبال علی گڑھ میں

طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے

آتی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکوں
کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو
گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے

شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز
غمکدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسیا ابھی

طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام نظم کے محذوف اشعار یہ ہیں

مستیٔ مے درونِ جام پرتوِ مے برونِ جام
اس کا مقام اور ہے اس کا مقام اور ہے

یوں تو پلانے آتے ہیں محفل کو ساقیانِ ہند
لیکن انھیں خبر نہیں یہ تشنہ کام اور ہے

جس بزم کی بساط ہو سرحدِ چیں سے مصر تک
ساقی ہے اس کا اور ہی مے اور جام اور ہے

باقی ہے زندگی میں کیا ذوقِ نمو اگر نہ ہو
حرکتِ آدمی ہے اور حرکتِ جام اور ہے

فانوس کی طرح جیو آتش بہ پیرہن رہو
اے جلنے والو لذتِ سوزِ تمام اور ہے

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کا لکچر

۹ فروری ۱۹۱۱ کو ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹرایٹ لا لاہور نے شب کے نو بجے طلبائے علی گڑھ کالج کے روبرو اسٹریچی ہال میں لکچر دیا۔ اس نہایت پر مغز و فلسفیانہ لکچر کا زیادہ تفصیلی ماحصل تو ہم کسی آئندہ اشاعت میں درج کر سکیں گے۔ سر دست اسی قدر بتانے پر اکتفا کرتے ہیں کہ آپ نے یہ امر طلبا کے ذہن نشین کیا کہ جیسی شاندار تاریخ مسلمانوں کی ہے دنیا میں اور قوم کی نہیں ہے۔ یہ کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کی جتنی مثالیں اسلامی تاریخ پیش کر سکتی ہے کسی اور قوم کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی، یہ کہ مسلمانوں کو اپنی تاریخ سے واقف ہونے اور اپنے مذہب کی سختی کے ساتھ پابندی کرنے کی اشد ضرورت ہے اور یہ کہ اگر اسلامی شعار سے آزاد ہو کر ہمارے نوجوان خواہ کیسی ہی ترقی کر جائیں مگر اپنے مذہب اور قوم کے لئے وہ باعثِ فخر نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ مجوزہ محمدن یونیورسٹی کی ایک یہ بھی خصوصیت ہو گی کہ وہ ہمارے نوجوانوں کو ان کے مذہب اور تاریخ سے آگاہ کرے گی۔ لکچر کے ختم ہونے پر ڈاکٹر ضیاءالدین احمد صاحب سینیر ٹیوٹر کالج نے منجانب ٹرسٹیان، اسٹاف اور طلبہ قابل لکچرار کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد جلسہ برخاست ہو جانے والا تھا مگر حاضرین کی پیہم درخواستوں اور بے حد اصرار پر ڈاکٹر اقبال صاحب نے اپنے اندازِ خاص میں اپنی ایک نہایت عمدہ نظم پڑھی جس کو حاضرین نے نہایت دلچسپی کے ساتھ سنا۔ ڈاکٹر ضیاءالدین احمد صاحب نے ڈاکٹر اقبال صاحب کا مکرر شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخاست ہوا۔

حضرت علامہ اقبال کے فاضلانہ خطباتِ اسلامیہ

علامہ ممدوح علی گڑھ تشریف لے گئے

حضرت علامہ اقبال نے گذشتہ سال مدراس کی انجمن اسلامیہ کی تحریک پر جو چھ خطبات مرتب کرنے کا وعدہ کیا تھا ان میں سے صرف تین خطبے مرتب ہوئے جو اس سال کے آغاز میں مدراس میسور اور حیدر آباد میں علامہ ممدوح نے بہ نفسِ نفیس سنائے تھے خدا کا شکر ہے کہ اب بقیہ تین خطبے بھی مکمل ہو گئے ہیں۔ حضرت علامہ اقبال نے سر راس مسعود نواب مسعود جنگ بہادر کی درخواست پر تمام خطبے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سنانے منظور فرمائے ہیں۔

حضرت علامہ آج بتاریخ ۷ ار نومبر فرنٹیر میل سے علی گڑھ جا رہے ہیں اور ایک ہفتہ میں تمام خطبے ختم کر کے ۲۸ ر نومبر تک لاہور واپس آجائیں گے۔ امید واثق ہے کہ جنوری کے آغاز میں تین تازہ خطبوں کے ارشاد کے لئے حضرت علامہ مدراس اور حیدر آباد کا سفر کریں گے"۔

حضرت علامہ اقبال علی گڑھ میں

طلباء اور اکابر کی طرف سے شاندار خیر مقدم

(نامہ نگار خصوصی کے قلم سے)

حضرت اقبال ۱۷ ر نومبر کی رات کو لاہور سے روانہ ہوئے۔ پروفیسر محمد عبداللہ صاحب چغتائی حضرت ممدوح کے ہمراہ گئے۔ ۱۸ ر نومبر کی دوپہر کو علی گڑھ پہنچے۔ اسٹیشن پر اساتذہ اکابر اور طلباء صفیں باندھے اور پھولوں کے ہار لئے کھڑے تھے۔ حضرت علامہ گاڑی سے اترتے ہی اکابر سے ملے پھر طلباء نے حضرت کے گلے میں ہار ڈالے اتنے ہار ڈالے کہ حضرت کا چہرۂ مبارک پھولوں سے چھپ گیا۔ اسٹیشن سے حضرت علامہ بگھی میں بیٹھ کر ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب کے بنگلے پر گئے جو مسلم یونیورسٹی میں فلسفے کے چیرمین ہیں اثنائے قیام علی گڑھ میں حضرت علامہ اسی بنگلے میں مقیم رہیں گے۔ سید راس مسعود صاحب ضروری کام کے لیے بھوپال چلے گئے ہیں۔ اور ۱۹ ر نومبر کو آنے والے ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین حضرت علامہ سے ملنے کے لئے آئے اور

اپنی جدید تالیف "اسلامی ہیئت" کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ پروفیسر مراد نے حضرت علامہ کو یونیورسٹی کی سیر کرائی۔ شام کو ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب نے حضرت علامہ کے اعزاز میں اساتذہ یونیورسٹی اور بعض دوسرے اکابر کو چائے کی دعوت دی۔ مولانا عبدالعزیز صاحب میمن کے ساتھ علومِ مشرقی کی ریسرچ کے متعلق دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔ شام کے وقت خواجہ غلام السیدین کے ہاں دعوتِ طعام تھی لیکچر سر راس مسعود کے بھوپال جانے کی وجہ سے ملتوی ہو گیا۔

اقبال۔ علی گڑھ میں

"حضرت علامہ اقبال ۱۷ر نومبر ۱۹۲۹ کی رات لاہور سے فرنٹیر میل میں سوار ہو کر علی گڑھ کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ پروفیسر عبداللہ چغتائی شریک سفر تھے۔ ۱۸ر نومبر کی دوپہر کو علی گڑھ پہنچے۔ اسٹیشن پر اساتذہ معززین یونیورسٹی ٹاؤن اور طلبا صفیں باندھے اور پھولوں کے ہار لئے کھڑے تھے حضرت علامہ گاڑی سے اترتے ہی سب سے ملے پھر طلباء نے ان کے گلے میں ہار ڈالے اتنے ہار کہ حضرت کا چہرہ مبارک پھولوں سے چھپ گیا۔ طلباء میں راقم بھی تھا۔ میں نے اس وقت علامہ کو پہلی بار دیکھا۔ نیچی قمیص۔ ہاف کوٹ اور شلوار زیب تن تھی، پنجابی جوتا پہنے ہوئے تھے میانہ قد بھرا ہوا جسم چہرہ انتہائی پُرکشش لیکن اس پر طویل سفر کی تکان کے اثرات نمایاں تھے۔

اسٹیشن سے حضرت علامہ بگھی میں بیٹھ کر ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب کے بنگلے پر گئے جو مسلم یونیورسٹی میں فلسفہ کے چیرمین تھے۔ علی گڑھ میں انھیں کے ساتھ قیام رہا۔ ان دنوں سر راس مسعود صاحب کسی ضروری کام سے بھوپال تشریف لے گئے تھے ۱۹ر کو واپس آنے والے تھے۔ ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد صاحب حضرت علامہ سے ملنے آئے اور زیر تالیف کتاب اسلامی ہیئت کے متعلق گفتگو کرتے رہے پروفیسر خلیل مراد نے علامہ کو یونیورسٹی کی سیر کرائی شام کو ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب نے معزز مہمان کے اعزاز میں اساتذہ یونیورسٹی اور دوسرے شہر کے اکابر کو چائے کی دعوت دی۔ مولانا عبدالعزیز صاحب میمن کے ساتھ علوم مشرقی کے متعلق دلچسپ گفتگو ہوتی رہی رات کو پروفیسر خواجہ غلام السیّدین پرنسپل ٹیچرس ٹریننگ کالج کے ہاں دعوتِ طعام تھی لیکن سر راس مسعود کی عدم موجودگی کے باعث نہ ہو سکا۔

۲۰ر نومبر ۱۹۲۹ کو صبح ہی سے علامہ اقبال کے شیدائیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا جن میں شیخ عطاءاللہ (مختار مسعود کے والد) جنھوں نے خطوط اقبال مقدمہ مولانا

حبیب الرحمن خاں شروانی مرتب کر کے شائع کئے) مولانا بے نظیر شاہ وارثی خاص طور پر قابل ذکر ہیں میزبان ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے پھر شام کو علامہ کے اعزاز میں چائے کی دعوت کا انتظام کیا۔ اسی روز سر سید راس مسعود بھوپال سے واپس تشریف لائے آپ نے ۸ ار نومبر کو علی گڑھ میں موجود نہ ہونے کے متعلق حضرت سے معذرت کی ساڑھے چھ بجے شام اسٹریچی ہال میں لکچر کا وقت تھا وقت مقررہ پر علامہ کے وہاں پہنچنے سے پیشتر سارا ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب پہلے لکچر کے صدر تھے آپ نے تقریر خیر مقدم میں فرمایا" تم سب اقبال اعظم کو جانتے ہو مجھ سے بہتر جانتے ہو میں ان کا کیا تعارف کراؤں میرا تعارف تعریف معروف بالمجہول کے سوا کچھ نہ ہو گا۔ اس کے بعد سر سید راس مسعود نے حضرت علامہ کے متعلق تعریفی کلمات ارشاد فرمائے جن کا بیشتر حصہ انتہائی ذاتی عقیدت کے جذبات سے لبریز تھا آپ نے فرمایا کہ میں دوران سفر یورپ ایک موقع پر بیمار ہو کر اسپتال میں پہنچ گیا تو وہاں میری تسکین کا سامان حضرت علامہ کے وہ ایک ہزار اشعار تھے، جو مجھے زبانی یاد تھے۔

اس کے بعد حضرت علامہ اپنا خطبہ پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے آپ نے ابتدا میں وقت کی ضروریات کے لحاظ سے شریعت اسلامی پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے اپنا پہلا خطبہ سنایا جو جنوری ۱۹۲۹ میں مدراس میں سنایا جا چکا تھا۔ حاضرین نے سارا خطبہ غور و توجہ سے سنا جلسہ ساڑھے چھ بجے سے شروع ہو کر آٹھ بجے تک جاری رہا پھر صدر جلسہ نے حضرت علامہ اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

راقم اس جلسہ میں بھی موجود تھا۔ یونیورسٹی کے کافی اساتذہ اور شعبۂ فلسفہ کے طلبہ کاپیاں اور قلم لے کر آئے تھے مگر موضوع کے انتہائی ادق ہونے کے باعث کچھ بھی نوٹ نہ کر سکے۔ پیچھے کی صفوں میں بیٹھے ہوئے نوجوان طلباء نے اپنی ذہنی تکان دور کرنے کے لئے آخر میں حضرت علامہ سے درخواست کی کہ کچھ کلام ارشاد فرمائیں اس درخواست کی پرزور تالیوں سے تائید ہوئی جس پر علامہ دوبارہ مائک پر آئے لیکن کلام سنانے کے بجائے نہایت تلخ لہجہ میں فرمایا کہ

" آپ لوگ کب تک شاعری کے دلدادہ بنے رہیں گے میں شاعر ضرور ہوں لیکن

عام شعرا جیسا نہیں ہوں میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ چھپ چکا ہے۔ اِسے پڑھ لیجئے ملک و ملّت انتہائی نازک دور سے گذر رہے ہیں اور جو اہم مسائل درپیش ہیں وہ سخت محنت اور غور و فکر کے متقاضی ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ تضیع اوقات عزیز اور محض دماغی عیاشی کے تمام رجحانات ترک کر دیئے جائیں میں اِس سفر میں اپنا کلام پڑھنے نہیں آیا ہوں لہٰذا معاف فرمائیے"

یہ کہہ کر علامہ اقبال ڈائس سے اُتر آئے اور بکثرت مداحوں کے جھرمٹ میں اپنی قیام گاہ روانہ ہو گئے۔

علامہؒ کے مزید پانچ لکچر اسٹوڈنٹس یونین ہال میں ہوئے۔ ایک ہفتہ قیام رہا اور اس کل مدّت میں مسلسل عصرانے اور کھانے کی دعوتیں رہیں اس سے قبل یونیورسٹی میں شاید کبھی دوسرے معزز مہمان سے اس قدر اظہارِ عقیدت کیا گیا"

مُسلم یُونیورسٹی میں علاّمہ اقبال کا پہلا خطبہ

عقیدت مندانِ حضرت علاّمہ کا اجتماع

(نامہ نگار خصوصی کے قلم سے)

علی گڑھ ۲۰ نومبر کل صبح ہی سے علامہ اقبال کے شیدائیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جن میں شیخ عطاء اللہ بٹ اور مولانا بے نظیر شاہ صاحب وارثی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر ظفرالحسن نے سہ پہر شام کے چار بجے حضرت علامہ کے اعزاز میں دعوت چائے کا انتظام کیا تھا۔ سید راس مسعود صاحب بھی تشریف لے آئے۔ آپ نے ۱۸ نومبر کو علی گڑھ موجود نہ ہونے کے متعلق حضرت علامہ سے معذرت کی۔ ساڑھے چھ بجے شام کو لکچر کا وقت تھا اس کے لیے اسٹریچی ہال منتخب کیا گیا تھا۔ حضرت علامہ کے ہال میں پہنچنے سے پیشتر سارا ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ سر راس مسعود اور ڈاکٹر ظفرالحسن حضرت علاّمہ کے ساتھ ہال میں پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب پہلے جلسے کے صدر تھے۔ آپ نے صدارتی تقریر میں کہا کہ تم سب "اقبال اعظم" کو جانتے ہو مجھ سے بہتر جانتے ہو میں اُن کا کیا تعارف کراؤں میرا تعارف "تعریف معروف بالمجہول" کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس کے بعد سید راس مسعود نے حضرت علامہ کے متعلق چند کلمات کہے جن کا بیشتر حصہ انتہائی ذاتی عقیدت کے جذبات سے لبریز تھا۔ سید راس مسعود نے فرمایا کہ میں دورانِ سفر یورپ میں ایک موقع پر بیمار ہو کر اسپتال میں پہنچ گیا تو وہاں میری تسکین کا سامان حضرت علاّمہ کے وہ ایک ہزار اشعار تھے جو مجھے زبانی یاد تھے۔

اس کے بعد حضرت علاّمہ اپنا خطبہ پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے آپ نے ابتداء میں وقت کی ضروریات کے لحاظ سے شریعت اسلامی پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے اپنا پہلا خطبہ سنایا جو گذشتہ جنوری میں سنایا جا چکا تھا۔ حاضرین نے سارا خطبہ انتہائی غور و توجہ سے سُنا جلسہ ساڑھے چھ بجے سے شروع ہو کر آٹھ بجے تک جاری رہا آخر میں ڈاکٹر ظفرالحسن صاحب نے حضرت علامہ اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

اسلام کا فلسفی اقبال علی گڑھ کے علمی مرکز میں

علمی مجسلیں علمی صحبتیں اور علمی تذکرے

علامہ اقبال علی گڑھ کی علمی دُنیا کی توجہات کا مرکز بنے ہوئے ہیں ہر وقت آپ کے اردگرد شائقین کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ ۲۰ر نومبر کو آپ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی عیادت کے لئے گئے جو عرصہ سے بعارضہ فالج" بیمار ہیں۔ صاحبزادہ صاحب علامہ موصوف کو دیکھتے ہی ہا ہا ہا کرنے لگے کیونکہ فالج کے باعث ان کی زبان چلنے سے رُک گئی ہے علامہ موصوف اِس حالت کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور آبدیدہ ہو گئے۔

عیادت کے بعد علامہ موصوف ڈاکٹر ضیاء الدین کے ہاں تشریف لے گئے جہاں دعوت تھی بہت سے معتقد حضرات اس دعوت میں شریک ہوئے اور علمی گفتگو ہوتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر رشید احمد صدیقی کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے اور انھیں پہلے کی بہ نسبت صحت یاب پایا۔

یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کی طرف سے علامہ ممدوح کو حوض شنا دری کے پاس چمن میں شام کے وقت ایٹ ہوم دیا گیا جس میں وائس چانسلر اور یونیورسٹی کے تمام ارکان موجود تھے شام کے چھ بجے تک پُرلطف صحبت جمی رہی۔

وہاں سے ڈاکٹر ظفر الحسن کے بنگلے پر سے ہوتے ہوئے یونیورسٹی کے یونین ہال میں تشریف لے آئے اور لکچر دیا اور کسلمندی کی وجہ سے ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ کے مکان پر چلے گئے۔

۲۱ر نومبر کی صبح کو اکثر طلبہ گذشتہ شام کے لکچر کے بعض نکات کی تشریح کے لئے علامہ موصوف کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور دن کا کھانا نواب مسعود جنگ بہادر وائس چانسلر کے ہاں کھایا۔ کھانے کے بعد پروفیسر مُراد سے مکالمہ ہوتا رہا شام کے وقت ۶½ بجے پھر لکچر دیا جو ۸ بجے ختم ہوا۔ رات کے گیارہ بجے تک پر لطف صحبت رہی۔ ۲۲ر کی صبح

کو پھر تشنگانِ علم اس منبعِ علوم سے کسبِ فیضان کرنے کیلئے آئے اور دن کا کھانا مسٹر بشیر حسین زیدی کے ہاں تھا۔

شام کی دعوت ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ کے ہاں تھی جنھوں نے بڑے تکلفات سے کام لیا لوگ ڈاکٹر صاحب سے شعر سننے کے متمنی تھے آپ نے پسند نہ فرمایا صاحبزادہ حمید بٹ نے "یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے" نظم ترنم سے پڑھ کر سنائی۔

شام کے وقت مسٹر راس مسعود کے ساتھ یونیورسٹی کی ترقی کے موضوع پر بات چیت ہوتی رہی رات کو علامہ ممدوح نے "انانیت انسانی اور اس کی لم یزلی" پر تقریر کی۔ رات کو دیر تک ڈاکٹر ظفر الحسن سے باتیں ہوئیں۔

اسٹوڈینٹس یونین کلب کا سپاسنامہ

بخدمت شریف ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی بار ایٹ لا۔

جناب عالی!

آج ہم ارکان مسلم یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج یونین انتہائی خلوص اور احترام کے ساتھ آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ آج کی شام ہمارے درمیان آپ کی موجودگی ہمارے لئے گہری مسرت اور ہمت افزائی کا باعث ہے جناب والا ہمیں پوری طرح احساس ہے کہ آج ہم اپنے قومی شاعر کے ساتھ ہیں وہی قومی شاعر جس نے ہمارے عہد کو جذبات قوم پرستی سے معمور کر دیا۔ اور زمانے کی رگ و پے میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ آج کی شام ہمارے لئے یوں بھی مسرت و انبساط کا باعث ہے کہ شیخ الجامعہ نواب مسعود جنگ بہادر کی ذات گرامی بھی ہمارے درمیان موجود ہے

جناب عالی! ہم یہ دیکھ کر فخر محسوس کرتے ہیں کہ نہ صرف ایک منفرد مفکر کی حیثیت سے آپ کی شہرت ملک کے باہر تک جا پہنچی ہے بلکہ زندگی کے جن اصولوں کی سرافرازی کے لئے آپ نے آواز بلند کی ہے وہ بھی عالم اسلام کے طول و عرض میں مقبول و معروف ہو گئے ہیں۔ آپ کی آواز سے ان اصولوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور دنیا بھر کے مسلمانوں نے ان کا اثر قبول کیا ہے ہمیں اندیشہ ہے کہ ہمارے الفاظ اس ذات گرامی کا شکریہ ہرگز ادا نہ کر سکیں گے جس نے مسلمانوں میں خود احترامی اور قوم پرستی کے احساسات پیدا کرنے میں اپنے عہد کے ہر شخص سے بڑا اور نمایاں حصہ لیا ہے۔ آپ ہمارے لئے وہ سب کچھ لے کر آگے بڑھے ہیں جو ہمارے شاندار ماضی کا خاصہ تھا۔ آپ کا کلام فارسی شاعری کے شاندار افکار عربوں کے بیش بہا تصورات اور رومی و عرفی۔ کے پیغامات کا نادر مجموعہ

ہے۔ آپ نے نہ صرف قدیم حقیقتوں کو از سرِ نو زندہ کیا ہے بلکہ ہمیں اس قابل کر دیا ہے کہ ہم ان کی صحیح اہمیت کو سمجھ سکیں۔ آپ نے ہمارے دلوں کو ان پیغامات کی طرف ہمیشہ کے لئے اس طرح پھیر دیا ہے جس طرح سورج مکھی کا پھول ہمیشہ سورج کی طرف مائل رہتا ہے آپ نے اپنے فلسفیانہ افکار کو اپنی شاعرانہ خصوصیات سے حیرت انگیز طور پر ہم آہنگ کیا ہے۔ یہ انفرادیت آپ کا نام ہمیشہ زندہ رکھے گی آپ کی شاعری نے ہمیں متحیر کر دیا ہے ہمیں اس جیسی کوئی بات اساتذہ کے کلام میں تلاش کرنے میں ناکامی ہوتی ہے آپ نے اپنی شاعری کو مشرق و مغرب کے بہترین افکار سے آراستہ کیا ہے آپ نے نطشے کے سپرمین کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے آپ کی شاعری میں گوئٹے کی گہرائی اور کانٹ کی گیرائی ملتی ہے۔ آپ نے مغرب کے ان مفکرین کے ان تصورات کو اس خوبصورتی کے ساتھ اسلامی روایات اور اردو شاعری کی موسیقی و نغمگی سے ہم آہنگ کیا ہے کہ آپ سے قبل برصغیر کا کوئی شاعر ایسا نہیں کر سکا تھا۔

ہم آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی میں آج آپ کی آمد ایک تاریخی واقعہ قرار پائے گی اور بعد میں آنے والی نسلیں آپ کو اپنے قابلِ تعظیم اسلاف میں شمار کریں گی۔

جنابِ عالی! ہم آپ کی اس عزت افزائی پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ جو آپ نے تازیست ملوٹین کا اعزازی رکن بن کر ہمیں بخشی ہے اب جبکہ آپ ہمارے ہو چکے ہیں ہمیں یقین ہے کہ آپ اکثر ہمارے ہاں آیا کریں گے تاکہ ہم اپنے دور کی ایک انتہائی عظیم شخصیت کے قرب سے مستفیض ہوں اور اسلامی نظریات کو جدید دور کے ایک انقلاب آفریں مفکر کے ذریعہ سمجھیں۔

ہم ہیں آپ کے فرمانبردار خادم

ممبران ایم یو انٹرمیڈیٹ کالج یونین

علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے سپاسنامہ کا جواب

نومبر ۱۹۲۹ میں جب علامہ اقبال علی گڑھ تشریف لے گئے تو یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین نے آپ کی خدمت میں ۲۹ نومبر کو ایک سپاسنامہ پیش کیا اور آنریری لائف ممبرشپ دی۔ استقبال کی گرمجوشی اور الفاظ کی کیفیت کا شکریہ ادا کرنے کے بعد علامہ اقبال نے سپاسنامہ کے جواب میں فرمایا:

"ممکن ہے کہ آپ کو یہ اندیشہ ہو کہ میں آپ کے سپاسنامے کے جواب میں ایک ناصحِ مشفق کی طرح آپ کو کوئی نصیحت کرنے یا بعض نکاتِ حکمت پیش کرنے لگوں گا لیکن میں آپ سے فوراً اور صاف کہے دیتا ہوں کہ میرے پاس اس قسم کی پند و نصیحت کچھ نہیں اور نہ میرے پاس کوئی نکتۂ حکمت ایسا ہے جو دوسروں کے لئے بطورِ دستورُ العمل پیش کر سکوں۔ مگر پھر بھی میں ایک دو باتیں ایسی کہوں گا جو کتابوں میں نہیں میرے ذاتی تجربہ پر مبنی ہے آپ جانتے ہیں کہ جب سے ہمارے تعلقات یورپ خصوصاً انگلستان سے قائم ہوئے ہیں اس وقت سے بہت سی چیزیں ہم تک وہاں سے پہنچی ہیں۔ سب سے اوّل چیز انگریزی لٹریچر ہے جو ہمارے بہت سے نوجوان مُصنّفین کے لئے تخلیقِ مضامین کا ذریعہ ہوا ہے وہ مضامین جنھوں نے موجودہ نسل کی ذہنیت کی تشکیل و توضیح میں بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ دوسری بات جو ہم کو انگلستان سے ملی ہے وہ انکار کی عادت ہے۔ میرے نزدیک یہ عادت اس ملک کے لئے بہترین نعمت ہے جس نے واقعات کے خلاف اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں اور مسلسل طور پر محض خیال آرائیوں سے کام لیتا رہا ہے۔ الغرض فکر ثقیل کی عادت ہم لوگوں کو انگلستان سے ملی ہے اور درحقیقت یہی وہ چیز ہے جس کی اس وقت تمام مشرق کو ضرورت ہے۔ تیسری چیز جو انگلستان نے ہم کو دی ہے وہ ایک مشتبہ قدر و قیمت کی چیز ہے اور وہ ڈیموکریسی ہے۔ جس صورت میں یہ ڈیموکریسی آچکی ہے اور جو بمقدار کثیر آئندہ آنے والی ہے وہ افسوس ہے کہ میرے دل کو نہیں بھاتی۔ ذاتی طور پر میں اس ڈیموکریسی کا معتقد نہیں ہوں اور محض اس لیے اس کو گوارا کر لیتا ہوں کہ اس کا نعم البدل فی الحال کوئی نہیں ہے۔ مگر خیر اب چونکہ یہ ڈیموکریسی انگلستان سے آچکی ہے

اس لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ موجودہ نسل کے نوجوانان کے لئے کس قدر مفید ہے۔ واضح ہو کہ ڈیموکریسی کے معنی صاف علی رؤس الاشہاد اور آزادی بحث و تمحیص ہیں۔

حضرات! میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ کل تمام دنیا کو فتح کر لینا چاہتے ہیں تو آپ کو لازم ہے کہ آپ اچھے مقرر بن جائیں اور یہ مقصد اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ یونین کی روایات کو قائم رکھا جائے۔

ایک دوسری بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ ہمارا انکشاف ماضی ہے۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنے ماضی سے محبت کرتے ہیں میں تو مستقبل کا معتقد ہوں مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لئے ہے کہ میں حال کو سمجھوں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ سرچشمۂ تہذیب و شائستگی کو سمجھا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آج دنیائے اسلام میں کیا ہو رہا ہے یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان گمگشتہ رشتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعہ سے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ رہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ علوم جدیدہ پر اصول استقرائی کا عاید کیا گیا ہے یہ وہ نعمت ہے جو قرآن شریف نے دنیا بھر کو عطا فرمائی ہے۔ اس طریقۂ استقرائی کے نتائج و ثمرات ہم کو آج نظر آرہے ہیں۔ میں گذشتہ بیس برس سے قرآن شریف کا بغور مطالعہ کرتا ہوں، ہر روز تلاوت کرتا ہوں مگر میں ابھی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ حصوں کو سمجھ گیا ہوں اگر خدا نے توفیق دی اور فرصت ہوئی تو میں ایک دن کامل تاریخ اس بات کی قلمبند کروں گا کہ دُنیائے جدیدہ اس مطمح حیات سے کس طرح ترقی کرتی ہوئی بنی ہے جو قرآن شریف [illegible] کرتا ہوں کہ یونیورسٹی ایسے لوگوں کی ایک تعداد پیدا کرے گی جو مطالعہ قرآن میں اپنی زندگیاں صرف کریں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ میرے ساتھ مل کر کام کریں۔ گذشتہ چند سال سے میں صرف اپنے جسم خاکی کا مالک ہوں، میری روح ہمیشہ آپ کی خدمات کے لیے حاضر رہی ہے اور جب تک میں زندہ ہوں وہ آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔"

(نعرۂ تحسین)

ITEM No.......... DT..........

اسٹوڈینٹس یونین کے جواب میں اقبال کی تقریر کے بعد صدر یونین پرو وائس چانسلر مسٹر ای اے ہارن کی تقریر

مسٹر وائس چانسلر اور ممبرانِ یونیورسٹی یونین

اب یہ فرض مجھ پر عائد ہوا ہے کہ اپنے ممتاز مہمانِ عزیز ڈاکٹر سر محمدؐ اقبال کے لئے ووٹ آف تھینکس (شکریہ) پیش کر کے جلسہ ختم کروں مجھے یہ کہنے میں کچھ بھی پس وپیش نہیں ہے کہ یہ ہفتہ اس قدر پُر از واقعات رہا کہ ہم نے یا یونیورسٹی نے اب تک نہ دیکھا ہوگا۔ اس ہفتہ میں ہم سب مختلف طریقہ سے اس امر کا شرفِ عظیم حاصل کر چکے ہیں کہ ایک ایسے صاحب طبع عالی سے نیاز حاصل ہوا ہے جس کا ذہن نہایت رسا جذبات وسیع اور خیالات رفیع سے معمور ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ ایک زبردست روح کے مالک ہیں (نعرہ ہائے مسرت) آج شام کو جب میں سپاسنامہ خیر مقدم کے جواب میں ڈاکٹر سر محمدؐ اقبال کی تقریر سن رہا تھا تو مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس تمام تقریر میں نہ صرف ایک پیشگو اور فلاسفر کی آواز سُنائی دیتی ہے بلکہ ایک ایسے شخص کی صدا ہے جس کا دل زبردست رواداری اور ہمدردی سے معمور ہے (نعرۂ تحسین) میں بلارعایت یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جو کچھ میں نے اس ہفتہ میں سنا اور جو کچھ میں نے اس پرازواقعات ہفتہ کے اس قابلِ یادگار جلسہ میں جو اواخر ہفتہ میں واقع ہوا سُنا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے لئے ڈاکٹر اقبال سے بہتر اور کوئی خضرِ طریق نہیں ہو سکتا اگر آپ مجھے اپنی ذاتی رائے ظاہر کرنے کی اجازت دیں تو میں عرض کروں گا کہ میرے لئے یہ ہفتہ عجیب وغریب گزرا ہے کیونکہ اگرچہ مجھے ہندوستان میں رہتے ہوئے تقریباً بیس سال گذر چکے ہیں مگر آج ہی میں نے محسوس کیا کہ مجھ میں ایشیائی روح جاری وساری ہو رہی ہے ایسا احساس مجھ کو یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد سے اب تک نہ ہوا تھا۔ جب میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو میں بھی آپ

جیسے بعض حضرات کی طرح سے ایک ہونہار فلسفی تھا اور میں بوسانکے اور لارڈ ہالڈین جیسی زبردست ہستیوں کے قدموں میں بیٹھا تھا لیکن اس زمانے سے میں ترقی معکوس کرتا رہا مگر اس ہفتہ میں مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں پھر اس زمرہ میں شامل ہو گیا ہوں۔ فلسفہ سے جو دلچسپی مجھے پہلے تھی وہ پھر پیدا ہو گئی ہے۔ نہ صرف فلسفہ بلکہ فلسفہ کے اس شعبہ سے جو مذہب و فلسفہ میں سلسلۂ ارتباط ہے۔ اس زبردست احسان کے لئے میں ڈاکٹر اقبال کا رہین منت ہوں جسے میں تسلیم کرنا چاہتا ہوں اور قبل ازیں کہ میں یہ جلسہ ختم کروں میں اپنے فلسفی ڈاکٹر ظفر الحسن کے قول کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے فرمایا تھا کہ وہ دن ہمارے لئے ایک مبارک دن ہوگا اگر ہم ڈاکٹر اقبال کو کسی طرح اپنے ہاں چند سال بسر کرنے پر مائل کر سکیں۔

اقتباس از روئداد مجلسِ منتظمہ اسٹوڈینٹس یونین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

THE POSTPONED MEETING OF THE SELECT COMMITTEE WAS HELD IN THE SELECT COMMITTEE ROOM. MR E.A. HORNE THE PRESIDENT WAS IN THE CHAIR AND THE FOLLOWING MEMBERS OF THE SELECT COMMITTEE WERE PRESENT MESSRS: KAZI GHAIASUDDIN, (2) AZMAT ALI VASTI, (3) MOHD AKHTAR SIDDIQI, (4) KAZI NOMAN JALALI, (5) MAHBOOB HASAN SHAH, (6) MALLICK GHULAM ANNAS, (7) NURUL NABI AND THE ACTING HONY. SECRETARY.

THE AGENDA WAS:

1. TO DISCUSS MATTERS IN CONNECTION WITH THE WELCOMING DR. SIR MOHD IQBAL IN THE UNION
2. ANY OTHER BUSINESS

AFTER THE MINUTES OF THE LAST MEETING WERE READ AND CONFIRMED THE FOLLOWING THINGS WERE DECIDED:

THAT WE SHALL WELCOME DR IQBAL ON THURSDAY THE 20TH NOVEMBER 1929 AT 8.45 P.M. WE SHALL CONFER THE LIFE HONORARY MEMBER-SHIP ON HIM.

WE SHALL PRESENT AN ADDRESS TO DR. IQBAL IF POSSIBLE. THE PERFORMANCE OF THE FUNCTION WILL BE THE SAME AS THAT WHICH WAS FOLLOWED AT THE TIME OF PRESENTING AN ADDRESS TO SIR SHAH SULEIMAN.

اقتباس از رودادِ مجلس منتظمہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

SPECIAL MEETING OF THE EXECUTIVE COUNCIL HELD ON TUESDAY THE 4TH DECEMBER 1934 AT 3 P.M. AT THE RESIDENCE OF KHAN BAHADUR MOULVI MOHD HABIBULLAH KHAN SAHEB.

PRESENT:

1. NAWAB MOHD ISMAIL KHAN SAHIB, BAR-AT-LAW, ACTING VICE-CHANCELLOR (IN THE CHAIR).
2. R.B. RAMSBOTHAM ESQR., PRO-VICE-CHANCELLOR.
3. NAWAB SADRYAR JUNG BAHADUR MOULVI MOHD HABIBUR RAHMAN KHAN SAHEB SHERWANI.
4. DR ZAKIR HUSAIN KHAN, M.A., Ph.D.
5. MR A.B.A. HALEEM
6. KHAN BAHADUR MOULVI MOHD HABIBULLAH KHAN SAHEB
7. MR A.M. KUREISHY

CONSIDERED:

RECOMMENDATION OF THE COURT UNDER RESOLUTION NO.20 DATED 25TH NOVEMBER, 1934, FOR CONFERRING THE FOLLOWING DEGREES, HONORIS CAUSA:

1. DR SIR ROSS MASOOD - DOCTOR OF LITERATURE
2. DR SIR S.M. SULEIMAN - DOCTOR OF LAWS
3. DR SIR MOHD IQBAL - DOCTOR OF LITERATURE

IT WAS POINTED OUT THAT THE CHANCELLOR ON THE RECOMMENDATION OF THE EXECUTIVE COUNCIL HAD ALREADY AGREED TO THE CONFIRMENT OF THE DEGREE OF DOCTOR OF LITERATURE HONORIS CAUSA ON DR SIR MOHD IQBAL IN 1924.

RESOLVED: THAT UNDER STATUTE 14 (2) THE COUNCIL RECOMMENDS TO HIS HIGHNESS THE CHANCELLOR FOR THE CONFERMENT OF THE FOREGOING HONORARY DEGREES ON DR SIR S.M. SULEIMAN AND DR SIR ROSS MASOOD. NO FRESH RECOMMENDATION WAS CONSIDERED NECESSARY FOR THE CONFIRMENT OF HONORARY DEGREE OF DOCTOR OF LITERATURE SIR MOHD IQBAL AS IT HAD ALREADY BEEN ACCEPTED BY THE CHANCELLOR IN 1924.

THE MEETING THEN ROSE.

SD.
MOHD ISMAIL KHAN
ACTING VICE-CHANCELLOR

SD.
A.E. ZOBAIRI
ACTING REGISTRAR
MUSLIM UNIVERSITY ALIGARH

اقتباس از روئداد مجلس منتظمہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

MINUTES OF THE SPECIAL MEETING OF THE EXECUTIVE COUNCIL OF THE ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY HELD ON 12th AUGUST, 1934.

APPENDIX

(VIDE E.C. RES. NO. 1 DATED 12TH AUGUST, 1934) REPORT OF THE APPOINTMENT COMMITTEE FOR THE SELECTION OF CANDIDATES FOR THE SELECTION OF CANDIDATES FOR THE POSTS OF READER AND LECTURER IN URDU, HELD ON SATURDAY, THE 11TH AUGUST, 1934 AT 11.15 A.M. IN THE VICE-CHANCELLOR'S ROOM.

PRESENT:

1. NAWAB MOHD. ISMAIL KHAN SAHEB, BAR. AT LAW ACTING VICE CHANCELLOR AND TREASURER (IN THE CHAIR)
2. R.B. RAMSBOTHAM ESQ. PRO VICE CHANCELLOR
3. MAULANA SYSED SULAIMAN NADVI SAHEB
4. DR. S.Z. HASAN
5. DR. S. HADI HASAN
6. DR. SIR MOHD. IQBAL DID NOT ATTEND THE MEETING BUT HAD SENT HIS WITHEN OPINION ABOUT THE CANDIDATES.

INTERVIEWED THE FOLLOWING CANDIDATES:

1. MR. MOHAMMAD YAHYA TANHA
2. MR. R.A. SIDDIQI
3. MR. J.A. KIDWAI
4. MR. S. TALIB ALI
5. MR. AGHA MOHD. ASHRAF
6. MR. S. HAMID HASAN BILGRAMI
7. MR. S. ALI AHSAN

RECOMMENDED:

1. THAT MR. RASHID AHMAD SIDDIQI BEING THE ONLY SUITABLE CANDIDATE, BE APPOINTED AS READER IN URDU.
2. THAT MR. SYED ALI AHSAN SAHIB BE APPOINTED LECTURER GRADE I. THE NAME OF MR. MOHAMMAD YAHYA TANHA WAS ALSO RECOMMENDED AS A SECOND COICE FOR THIS POST.
3. THAT THE POST OF LECTURER GRADE II (WHICH WILL FALL VACANT IF M. ALI AHSAN SAHEB IS APPOINTED LECTURER GRADE I) BE OFFERED TO MR. JALIL AHMAD KIDWAI OR FAILING HIM TO MR. AGHA MOHD. ASHRAF.

THE MEETING THEN ROSE.

SD.

MOHD. ISMAIL KHAN
ACTING VICE CHANCELLOR

AZMAT ELAHI ZOBAIRI
ACTING REGISTRAR
MUSLIM UNIVERSITY ALIGARH

سر سید اور اقبال

مسلمانوں کی رائے اور ان کے خیالات ہر ایک امر میں تقلید کرتے کرتے ایسے پست و پامال ہو گئے ہیں جس کے سبب کسی قسم کی تحریک ان میں نہیں ہوتی۔

(سر سیّد)

زندگی کے جس جس شعبے میں تقلید کا عنصر نمایاں ہوگا اس میں حرکت مفقود ہوگی۔

(اقبال)

جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی بول چال کی صفائی پر کوشش کی رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور مضامین خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا اس میں کوشش کی کہ جو لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسروں کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔

(سر سیّد)

شاعری میں لٹریچر بہ حیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔

(اقبال)

کسی قوم کے لئے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھو دے۔

(سر سید)

قومی تاریخ حیاتِ ملیہ کے لئے بہ منزلہ قوت حافظہ کے ہے۔

(اقبال)

یہ مسجد (قوت الاسلام) نہایت عجیب و غریب ہے یقین ہے کہ ایسی بڑی مسجد روئے زمین پر نہ ہوگی اور چشم فلک نے بھی نہ دیکھی ہوگی۔ حقیقت میں اپنا مثل روئے زمین پر نہیں رکھتی باوجود اس قدر بلندی اور بڑائی کے ایسی خوش وضع اور خوبصورت ہے جس کا کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔

(سر سید)

مسجد قوت الاسلام دہلی کے جلال اور قوت نے مجھے اس قدر مرعوب کیا کہ اس میں نماز پڑھنے کا

خیال مجھے ایک جسارت معلوم ہوا اس کا دقار مجھ پر چھا گیا۔

(اقبال)

غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروّتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں ہیں اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیئے اور جو مصیبت پڑی ہے اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔

(سرسید)

میری قوم کی حالت ناگفتہ بہ ہے میں ایسی حالت میں اسے چھوڑ دوں تو کیا یہ فعل میری اپنی فطرت سے غدّاری کے مترادف نہ ہوگا۔

(اقبال)

فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور کلمۂ لاالٰہ الاّ اللہ کا تاج ہمارے سر پر۔

(سرسید)

ہماری درسگاہوں میں مذہبی تعلیم ہونی چاہیئے تاکہ اس طرح روحانی اور مادی امور کو ایک جگہ جمع کیا جائے اس زمانے میں وہی لوگ محفوظ رہیں گے جو زمانۂ حاضرہ میں انسان کے معاملات کو بنانے اور بگاڑنے والی قوتوں سے باخبر ہوں گے۔

(اقبال)

خدا دارم دلِ بریاں زعشقِ مصطفےؐ دارم
نہ دارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

(سرسید)

سالارِ کارواں ہے میرِ حجازؐ اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

(اقبال)

"وہ (سرسیّد) دورِ جدید کے پہلے مسلمان ہیں جس نے آنے والے زمانے کے ایجابی مزاج کی ایک جھلک دیکھ لی۔ لیکن ان کی حقیقی عظمت اس میں ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جس نے اسلام کی نئی تعبیر کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کے لئے سعی کی۔"

اقبال

"سرسیّد کی ذات بڑی بلند تھی، بڑی ہمہ گیر، افسوس ہے مسلمانوں کو پھر ویسا کوئی رہنما نہیں ملا۔"

اقبال۔

"علی گڑھ کی بدولت ایک عام بیداری پیدا ہوئی اور قوم کے قوائے علم وعمل حرکت میں آئے۔ یہ گویا ہماری نشاۃ الثانیہ ہی کی ایک تحریک تھی۔"

اقبال

سیّد کی لوحِ تُربت

اے کہ تیرا مُرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر
اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر

اِس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ
شہر جو اُجڑا ہوا تھا اُس کی آبادی تو دیکھ

فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی

سنگِ تُربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دُنیا میں ہے تعلیمِ دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دُکھ جائے تری تقریر سے

محفلِ نَو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

تو اگر کوئی مدبّر ہے تو سُن میری صدا
ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا

عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم
شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم

پاک رکھ اپنی زباں، تلمیذِ رحمانی ہے تو!
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو!

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

توقیتِ اقبال

۹ نومبر ۱۸۷۷ء سیالکوٹ میں پیدا ہوئے

۱۸۸۳ء اسکاچ مشن اسکول میں داخل ہوئے

۱۸۹۰ مڈل اسکول کا امتحان پاس کیا

۱۸۹۳ انٹرنس کا امتحان پاس کیا

۱۸۹۵ء ایف اے کا امتحان پاس کیا

۱۸۹۵ گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے میں داخل ہوئے۔

۱۸۹۷ بی اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور انگریزی اور عربی میں اول آنے پر طلائی تمغے حاصل کئے۔

۱۸۹۸ سرسید کی وفات پر مادۂ تاریخ نکالا۔

۱۸۹۹ فلسفہ میں ایم اے کیا اور بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے۔

۱۹۰۰ انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں اپنی نظم نالۂ یتیم پڑھی

۱۹۰۱ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے۔ لیکن طبیّ بنیاد پر انھیں نہیں لیا گیا

۱۹۰۲ 'مخزن' میں اقبال کی نظم 'سید کی لوحِ تربت' شائع ہوئی۔

۱۹۰۳ علم الاقتصاد شائع ہوئی۔

۱۹۰۴ ٹامس واکر آرنلڈ کے انگلستان روانہ ہونے پر نظم نالۂ فراق لکھی

۱۹۰۵ انگلستان روانہ ہوئے اور کیمبرج یونیورسٹی کے کالج میں داخلہ لیا۔

۱۹۰۷ میونخ یونیورسٹی جرمنی سے پی ایچ ڈی کیا اور اسی سال لندن یونیورسٹی میں عارضی پروفیسر مقرر ہوئے

۱۹۰۷ طلبائے علی گڑھ کالج کے نام نظم شائع ہوئی۔

۱۹۰۸ مسلم یونیورسٹی کے چندہ کے لئے مولوی نظر محمد کی دعوت رد کی اور دعوت کے صرفہ کے بقدر رقم مبلغ چالیس روپیہ علی گڑھ کالج مسلم یونیورسٹی فنڈ میں دیا۔

۱۹۰۸ علی گڑھ کالج نے فلسفہ کی پروفیسری کی پیش کش کی

۹ر فروری ۱۹۱۱ علی گڑھ کالج میں توسیعی خطبہ دیا۔

۱۹ر فروری ۱۹۱۱ برکت علی محمڈن ہال لاہور میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لیے تقریر کی۔

دسمبر ۱۹۱۱ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے ترجمانِ حقیقت کا خطاب دیا۔

ستمبر ۱۹۱۱ مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے دستور اور بائی لاز کی کمیٹی میں اقبال شریک ہوئے۔

دسمبر ۱۹۱۲ مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسے لکھنؤ میں شریک ہوئے۔

۱۹۱۳ مسجد مچھلی بازار کانپور کے ملزموں کی مقدمہ کی پیروی کے لئے کانپور آئے۔

۱۹۱۴ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسہ کے موقع پر نظم بھیجی

۱۹۱۵ اسرارِ خودی کی اشاعت ۔ اور اسی سال ان کی والدہ کا انتقال ہوا۔

۱۹۱۷ مدینہ منوّرہ کا ایک کبوتر حاصل کر کے اسے پالا

۱۹۱۸ رموزِ بےخودی کی اشاعت

۱۹۲۳ پیامِ مشرق کی اشاعت

۱۹۲۴ بانگِ درا کی اشاعت

۱۹۲۴ کورٹ اور اکیڈمک کونسل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اقبال کو اعزازی ڈگری دینے کی تجویز منظور کی۔

۱۹۲۵ مجوزہ شعبہ علومِ اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لئے تجاویز بھیجیں۔

۱۹۲۷ زبورِ عجم کی اشاعت

جنوری ۱۹۲۹ تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کے عنوان سے مدراس میں تین خطبے دیئے۔

۱۸ر نومبر ۱۹۲۹ علی گڑھ آئے

۲۰ر نومبر ۱۹۲۹ شب میں آٹھ بج کر پینتالیس منٹ پر یونین ہال میں طلبہ نے سپاسنامہ پیش کیا۔ اسی زمانے میں علامہ اقبال نے یہاں چھ خطبے دیئے جسے نذیر نیازی نے اردو میں ترجمہ کیا

۱۹۳۲ جاوید نامہ کی اشاعت

۱۹۳۲ تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے یورپ گئے اور اسی سفر میں مسجد قرطبہ بھی دیکھی۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۳۳ شاہ افغانستان کی دعوت پر لاہور سے کابل روانہ ہوئے۔

۱۹۳۴ مثنوی مسافر کی اشاعت

اگست ۱۹۳۴ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ریڈر کے لئے انتخابی کمیٹی کے ممبر سید سلیمان ندوی اور اقبال تھے۔

۱۸ دسمبر ۱۹۳۴ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اسپیشل کانوکیشن میں شرکت کے لیے علی گڑھ آئے۔

۲۲ دسمبر ۱۹۳۴ اقبال کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اسپیشل کانوکیشن میں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دی۔

۱۹۳۵ حالی کی صد سالہ تقریبات میں شرکت کے لئے پانی پت گئے۔

۱۹۳۵ بال جبریل کی اشاعت

۱۹۳۶ ضرب کلیم کی اشاعت

۱۹۳۶ مثنوی 'پس چہ باید کرد' اے اقوام شرق کی اشاعت

۱۹۳۷ نادرہ مسعود کی پیدائش پر قطعۂ تاریخ کہا

۱۹۳۷ الہ آباد یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ صبح سوا پانچ بجے لاہور میں وفات پائی۔

ماخذ و مصادر

۱۔ آہنگ بازگشت — محمد سعید
۲۔ اقبال کے حضور — نذیر نیازی
۳۔ اقبال — مرتبہ انجمن ترقی اردو
۴۔ اقبال نامہ — شیخ عطاء اللہ
۵۔ اقبال اور عبدالحق — ممتاز حسن
۶۔ اقبال کی تیرہ نظمیں — اسلوب احمد انصاری
۷۔ اقبال کی علمی اور تنظری شعریات — مسعود حسین خاں
۸۔ انوار اقبال — بشیر احمد ڈار
۹۔ اوراقِ گم گشتہ — رحیم بخش شاہین
۱۰۔ باقیاتِ اقبال — عبدالواحد معینی
۱۱۔ حیات جاوید — الطاف حسین حالی
۱۲۔ حیاتِ اقبال — چراغ حسن حسرت
۱۳ چند ہم عصر — عبدالحق
۱۴۔ خطوط اقبال — رفیع الدین ہاشمی
۱۵۔ دانائے راز — نذیر نیازی
۱۶۔ ذکر اقبال — عبدالمجید سالک
۱۷۔ ذکر عبدالحق — ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
۱۸۔ روزگار فقیر — فقیر سید وحید الدین
۱۹۔ روایاتِ اقبال — عبداللہ چغتائی
۲۰۔ زندہ رود — جاوید اقبال
۲۱۔ سفرنامۂ پنجاب — سید اقبال علی

۲۲- سرگزشتِ اقبال ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

۲۳- شادِ اقبال ڈاکٹر محی الدین قادری زور

۲۴- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کلینڈر

۲۵- علامہ اقبال بھوپال میں عبدالقوی دسنوی

۲۶- فلسفۂ انبساط پنڈت حبیب الرحمن شاستری

۲۷- فکرِ اقبال خلیفہ عبدالحکیم

۲۸- کلیاتِ اقبال اقبال

۲۹- گنجہائے گرانمایہ رشید احمد صدیقی

۳۰- گفتارِ اقبال رفیق افضل

۳۱- متعلقات خطباتِ اقبال سید عبداللہ

۳۲- مکاتیب اقبال بنام گرامی

۳۳- مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین

۳۴- ملفوظاتِ اقبال محمود نظامی

۳۵- اخبار پنجاب امرتسر

۳۶- اردو مسعود نمبر عبدالحق

۳۷- اردو اقبال نمبر عبدالحق

۳۸- اقبال۔ ماہنامہ مدیر ظفر احمد صدیقی

۳۹- العلم الطاف علی بریلوی

۴۰- روئیداد مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین

۴۱- سہیل رشید احمد صدیقی

۴۲- مخزن شیخ عبدالقادر

۴۳- نیرنگِ خیال اقبال نمبر

۴۴- نقد و نظر اسلوب احمد انصاری

۴۵- نقوش محمد طفیل